پبلشر

کیپٹن (پنشنر) ملک خادم حسین فیکٹری ایریا ربوہ

باجازت

نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ ربوہ ضلع جھنگ

جون ۱۹۷۳ء — مطابق — جمادی الاول ۱۳۹۳ھ

ضیاء الاسلام پریس ربوہ

حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود و
مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام (۱۹۰۸)

۲۔ حضرت الحاج حافظ حکیم نور الدین
خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ
(۱۹۰۸ - ۱۹۱۴)

۳۔ حضرت الحاج مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی (المصلح الموعود) رضی اللہ تعالیٰ عنہ
(۱۹۱۴ - ۱۹۶۵)

۴۔ حضرت حافظ مرزا ناصر احمد
خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز
(۱۹۶۵)

۲

۳

۴

الف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

میری یہ دیرینہ خواہش تھی کہ میں اپنے والد صاحب حضرت [illegible] احمد صاحب ایڈیٹر "الفضل" قادیان سے درخواست کروں کہ وہ اپنے حالات زندگی قلمبند فرمائیں، مگر کبھی [illegible] خوف سے اس کے اظہار کی جرأت نہ کر سکا۔ آخر ایک دن میں نے کیا دیکھا کہ والد ماجد خود ہی اپنے حالات زندگی تحریر فرما رہے ہیں۔ چنانچہ اسی وقت میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو یہ حالات زندگی کتابی شکل میں شائع کراؤں گا۔

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج میں والد ماجد کے "خود نوشت حالات زندگی" "چھتیس سال قادیان میں" کے عنوان سے چھپوانے کی توفیق پا رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں اپنی اہلیہ صاحبہ نفیسہ بیگم دختر مکرم و محترم جناب کیپٹن ملک خادم حسین صاحب سابق ناظر امور عامہ صدر انجمن احمدیہ ربوہ، سابق پرائیویٹ سیکرٹری حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے

ب

والد ماجد کے حالات زندگی کی دستی کاپیاں انتہائی احتیاط سے سنبھال رکھیں، اور پھر مجھ تک بحفاظت جرمنی میں بھجوائیں۔ خدا تعالیٰ انہیں اس ہمدردی اور نوازش کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

والد ماجد کی وفات حسرت آیات مارچ ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ ہمارے دل اس صدمہ سے نڈھال تھے، لیکن ہمارے پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ جمعہ میں حضرت والد ماجد کی خدمات، قابلیت اور قربانیوں کا ایسے شاندار الفاظ میں ذکر فرمایا کہ ہمارے سب غم دور ہو گئے۔

اس خطبہ جمعہ کا ایک اقتباس کتاب کے صفحہ ج پر درج کر رہا ہوں، تا کہ یہ مقدس الفاظ محفوظ ہو جائیں، اور والد محترم کے لئے بزرگوں اور دوستوں کو زیادہ سے زیادہ دعائیں کرنے کی تحریک ہو۔

آمین یا رب العالمین

خاکسار خواجہ منیر احمد

حال فرینکفورٹ، مغربی جرمنی

۲ اکتوبر ۱۹۸۳ء

اقتباس

از خطبہ جمعہ فرمودہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رض

۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء ربوہ - (۱۵ اپریل ۱۹۵۶ء)

نماز جنازے پڑھانے سے پہلے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رض نے فرمایا -

"ایک جنازہ خواجہ غلام نبی صاحب سابق ایڈیٹر الفضل کا ہے کچھ عرصہ ہوا، ان کے ایک بیٹے نے کسی غلط فہمی کی بناء پر مجھے لکھا کہ انہیں ربوہ آنے کی اجازت دی جائے، ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ میں نے اسی وقت جواب لکھوایا کہ انکو ربوہ میں آنے سے ہرگز کوئی روک والا نہیں، بلکہ میں تو ان کے لیے مکان کا بھی انتظام کر دوں گا۔ مگر اس کے بعد وہ انہیں ربوہ نہیں لائے۔ اگر وہ انہیں یہاں لاتے تو ممکن ہے ان کا علاج ہو سکتا، یا ممکن ہے ان کے آخری وقت میں اگر ان کے کچھ پرانے دوست اور صحابہ وغیرہ ملتے تو یہ امر ان کے دل کے اطمینان اور تسلی کا موجب ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ وہ انہیں ربوہ نہ لائے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے میں نے پھر توجہ دلائی تھی کہ ابھی تک وہ انہیں کیوں نہیں لائے۔ مگر معلوم ہوتا ہے میرا خط انہیں نہیں پہنچا اور وہ وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

"الفضل" کے ابتدائی اسسٹنٹ ایڈیٹر درحقیقت وہی تھے

ایڈیٹر میں خود ہوا کرتا تھا اور اسسٹنٹ ایڈیٹر وہ تھے ۔ انکی تعلیم زیادہ نہیں تھی ۔ صرف مڈل پاس تھے ۔ مگر بہت ذہین اور ہوشیار تھے ۔ میری جس قدر پہلی تقریریں ہیں وہ ساری کی ساری انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں ۔ وہ بڑے اچھے زود نویس تھے ۔ اور ان کے لکھے ہوئے لیکچروں اور خطبات میں مجھے بہت کم اصلاح کرنی پڑتی تھی ۔ پھر وہ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے اور ایسے زبردست ایڈیٹر ثابت ہوئے کہ درحقیقت پیغامیوں سے زیادہ ٹکر انہوں نے لی ہے ۔ پیغام صلح کے وہ اکثر جوابات لکھا کرتے تھے جس طرح وہ میرے ابتدائی خطبات وغیرہ بھی لکھتے رہے اسی کی وجہ سے مشہور ہوئے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا جماعت پر ایک بہت بڑا احسان ہے اور جماعت ان کے لئے جتنی بھی دعائیں کرے اس کے وہ مستحق ہیں ۔"

خاندانی حالات

کھاریاں ضلع گجرات میں ۲۰-۲۱ جنوری ۱۹۵۱ء کی درمیانی شب بستر پر لیٹے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اپنے حالات زندگی جس قدر ذہن میں محفوظ ہیں مختصر طور پر قلمبند کرنے کی کوشش کروں، تا بعد میں آنے والی نسل اگر خدا تعالیٰ چاہے تو اس طرح اندھیرے میں نہ رہے جس طرح میں اپنے آباؤ اجداد کے متعلق ہوں، اور اگر ممکن ہو تو ان حالات سے کچھ نہ کچھ فائدہ بھی اٹھا سکے۔ سو اس خیال کے ماتحت ۲۱ جنوری ۱۹۵۱ء بروز اتوار میں نے یہ حالات لکھنے شروع کئے۔

جہاں تک مجھے اپنے تایا غلام محمد صاحب سے بچپن میں اپنے خاندان کے متعلق کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ:

کسی زمانہ میں جس کی تفصیل اور تعیین ان کو بھی معلوم نہ تھی ہمارے
آباؤ اجداد جو راجپوت نسل کے نومسلم تھے اور کشمیر میں بود و باش رکھتے
تھے، ڈار گوت کے تھے۔ قحط اور ملکی انقلاب کے دوران میں کشمیر سے نقل
مکانی کر کے پنجاب میں آ بسے اور ریاست کی حدود کے متصل موضع بلانی
میں رہنے لگے۔

میرے والد صاحب کا نام خواجہ وہاب دین تھا اور دادا صاحب
کا نام خواجہ محمد صدیق۔ میرے والد صاحب کے دو بھائی اور تھے، ان میں
سب سے بڑے غالباً میری ولادت سے بھی قبل فوت ہو چکے تھے۔ دوسرے
بھائی کا نام خواجہ غلام محمد تھا۔ جو اپنے زمانے کے لحاظ سے پڑھے لکھے تھے۔
اور اپنے گاؤں (بلانی) میں چند تعلیم یافتہ احباب جو کہ ان کے ہم عصر تھے میں تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے۔
میری پرورش انہی کے زیر سایہ ہوئی اول اس لئے کہ میرے والد صاحب
فوج میں ملازم تھے اور میں بہت تھوڑا عرصہ بچپن میں ان کے پاس رہا۔
دوسرے میرے بچپن میں ہی وہ فوت ہو گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

میرے تایا صاحب نے میری ولادت کی جو یادداشت اپنے رجسٹر
میں لکھی ہوئی تھی اس کی رو سے ستمبر ۱۸۹۳ء کی کسی تاریخ جو مجھے یاد نہیں
میں پیدا ہوا۔

ابتدائی تعلیم

بالکل ابتدائی زندگی کے کچھ کچھ حالات مجھے اس وقت یاد ہیں

جب مجھے والد صاحب اپنے ساتھ رُڑکی جہاں آپ فوج میں ملازم تھے اس لئے لے گئے کہ وہاں پڑھائی شروع کرائیں، کیونکہ اس وقت گاؤں میں چھوٹا موٹا بھی کوئی مکتب نہ تھا۔ اس وقت میری عمر اتنی چھوٹی تھی کہ اس وقت کی ایک دو باتیں مجھے یاد ہیں۔

ایک تو یہ کہ فوجی بارکوں کے قریب ہی ایک مکتب میں مجھے پڑھنے کے لئے بھیجا تھا۔ اور جب میں واپس آتا تو والد صاحب مجھے پکنا کچھ گرم دودھ پلایا کرتے جسے پینے کو میرا دل نہ چاہتا اور مجبور ہو کر پیتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انہی دنوں والد صاحب کو ہنی فوج کے ساتھ فوری طور پر ہانگ کانگ جانے کا حکم ہوا۔ اور جب رات کو روانہ ہونے لگے تو مجھے گود میں اٹھا کر سینے سے لگایا۔ خوب پیار کیا، اور میرے منہ پر آپ کے چند آنسو گرے۔ آپ مجھے گاؤں کے ایک شخص کے حوالے کر کے روانہ ہو گئے، اور انہوں نے مجھے وطن پہنچا دیا۔

گاؤں میں چونکہ مکتب نہ تھا اس لئے والدہ ماجدہ نے جن پر خدا تعالیٰ کی بڑی بڑی رحمتیں ہوں، اور جن کا سایہ خدا تعالیٰ نے ہم پر لمبے عرصہ تک قائم رکھا، مجھے اپنے میکہ موضع کھٹہ میں ایک میاں صاحب جن کا نام محمد عالم تھا اور جو بچوں کو مسجد میں کچھ لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے، ان کے پاس بٹھا دیا۔ اس وقت کی نانی صاحبہ کی محبت اور پیار اور خاطرداری مجھے ساری عمر یاد رہی۔ ان کا سلوک اور محبت مجھے ماں کی محبت سے بالکل مستغنی کرنے والا تھا۔ نیز ماموں محمد صدیق صاحب کا پیار

خواجہ غلام نبی صاحب سابق ایڈیٹر الفضل

آسودہ حال گھرانے کی طرح چلاتے ہوئے کچھ زمین بھی خرید لی تھی جو ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ سالانہ کچھ نہ کچھ غلہ اس سے آجاتا۔ والدہ ماجدہ نے نہ صرف ہماری پرورش بڑے سلیقے سے کی بلکہ جوں توں کرکے میری پڑھائی بھی جاری رکھی کہ مجھے والد صاحب کی وفات کا کم سے کم احساس ہو۔

بچپن میں میرا جسم بہت دُبلا پتلا تھا، صحت عموماً کمزور رہتی تھی۔ عام طور پر نکسیر پھوٹتی تھی اس لئے میرے کھانے پینے کے لئے آپ خاص احتیاط فرماتیں۔ گرمیوں میں سکنجبین کا شربت گھر میں کئی بوتلیں بنواتیں اور مجھے مجبور کرکے پلواتیں۔ اور بھی چھوٹی موٹی دوائیں جو میسر آسکتی تھیں استعمال کراتی رہتی تھیں۔ اسی طرح اپنے بھائیوں اور ہم جماعت ساتھیوں سے لباس کے لحاظ سے بھی کم نہ رہنے دیتیں۔ غیرت اور خودداری ان میں خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت نمایاں تھی یہی مجھ میں دیکھنا پسند فرماتیں۔

جذبہ خُودداری

ایک دفعہ گھٹیالیاں میں عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر چند آسودہ حال لوگوں نے گائے کی قربانی کا انتظام کیا۔ سارا انتظام گاؤں کے پٹواری میاں محمد دین صاحب احمدی کے ہاتھ میں تھا۔ چونکہ گائے کھلے میدان میں قصبہ کے قریب ہی ذبح کرینگے، اس لئے ہم چند لڑکے کھیلتے کُودتے وہاں جا پہنچے۔ گاؤں کے ماحول اور اس عمر کے لحاظ سے یہ نظارہ بھی

ہمارے لئے تماشہ سے کچھ کم نہ تھا اس لئے ہم اخیر وقت تک وہاں ڈٹے رہے جب گوشت تقسیم کرکے اٹھانے لگے تو میاں محمد دین صاحب نے جو مجھے عام طور پر محبت اور پیار کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور اپنے بچوں ایسا سلوک کرتے تھے، میرا نام لے کر کہا، یہ یتیم ہے اسے گوشت دینا چاہیئے انہوں نے یہ بات، بڑے محبت آمیز لہجہ میں کہی۔ لیکن اس چھوٹی عمر میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ انہوں نے مجھ پر آگ کا انگارہ پھینک دیا ہے، میں سخت غمگین ہو کر وہاں سے بھاگا اور سیدھا والدہ ماجدہ کے پاس آ کر یہ بات بتائی، انکو بھی یہ بات اچھی نہ لگی اور وہ خود میاں صاحب موصوف کے گھر گئیں اور گلہ کیا کہ آپ نے یہ کہہ کر لڑکے کا دل دکھایا ہے۔ اس کے بعد ان کے دل میں میری محبت اور بھی بڑھ گئی۔ اور جب خدا تعالیٰ نے مجھے قادیان میں رہائش اختیار کرنے کی سعادت بخشی تو میاں صاحب موصوف مجھ سے مل کر بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا کرتے۔ انکی اہلیہ صاحبہ ہمارے گھر تشریف لایا کرتیں، اور میرے بال بچوں کو میری بچپن کی باتیں سنا کر بڑی خوشی کا اظہار فرماتیں ؛

مزید تعلیم

غرض والدہ ماجدہ نے میری تعلیم جاری رکھنے کی ہر ممکن کوشش فرمائی۔ اپنے گاؤں سے چار جماعتیں ختم کرنے کے بعد مجھے قریب کے ایک گاؤں بیسہ میں جہاں پانچویں جماعت تک سکول تھا، داخل کیا گیا۔

یہاں میرا ایک بچپن کا دوست جس کا نام فیروز خان ہے، ایک سال قبل
جا چکا تھا۔ ہم دونوں پھر اکٹھے ہو گئے۔ روزانہ صبح جاتے اور شام کو
واپس گھر آ جاتے۔ وہ گاؤں ہمارے گاؤں سے اڑھائی تین میل کے فاصلہ
پر تھا۔ ایک سال کے بعد میں پرائمری پاس کر کے وہاں سے فارغ ہو گیا۔

اس سے آگے قدم بڑھانا مشکل نظر آتا تھا۔ قریب کوئی ایسا
سکول نہ تھا اور گھر سے باہر رہ کر خرچ چلانا مشکل تھا۔ اس جد و جہد
میں یہ صورت ممکن نظر آئی کہ ریاست جموں و کشمیر کے ایک پرانے شہر
بھمبر میں جہاں ایک ورنیکلر سکول تھا اور کوئی فیس نہ لی جاتی تھی تعلیم
حاصل کی جائے۔ ہمارے گاؤں سے وہ شہر ۱۴ میل کے فاصلہ پر تھا۔

وہاں سے روزانہ گھر آنا مشکل تھا اور وہاں رہائش کی کوئی صورت نہ تھی
سکول کے ساتھ بورڈنگ کا انتظام نہ تھا۔ مگر باوجود اس مشکل کے بھی
بہتر معلوم ہوا کہ وہاں قسمت آزمائی کی جائے۔ کچھ عرصہ قبل ایک مکتب
کا دوست جس کا نام شیخ حسان ہے وہاں جا چکا تھا۔ وہ ایک گھر میں رہتا
تھا۔ میں نے اس کو آمادہ کر لیا کہ میں بھی اس کے ساتھ رہ سکوں، اور وہ ساتھ
رہ جانے کی وجہ سے خوشی تیار ہو گیا۔ چنانچہ میں جا کر سکول میں داخل
ہو گیا۔ اس وقت سکول کے ہیڈ ماسٹر ایک شریف ہندو تھے (جن کا نام
لالہ بیلی رام تھا) وہ میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے، اور فرمایا اگر
تم پانچ سات لڑکے ہو جاؤ تو ہم بورڈنگ بنوانے کی کوشش کریں گے۔

اس گھر میں چند روز ہی رہ سکا، کیونکہ وہاں رہ کر پڑھائی بالکل نہ

انہی دنوں محمد اشرف صاحب وطن تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ قادیان لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن اس میں مشکل یہ درپیش تھی کہ گاؤں میں احمدیت کے خلاف سخت مخالفت پائی جاتی تھی اور میرے تایا صاحب اس میں پیش پیش تھے۔ اس وجہ سے وہ میرے قادیان جانے پر رضامند نہ تھے۔ البتہ والدہ ماجدہ میرے ساتھ متفق تھیں۔ باوجودیکہ سب رشتہ داروں اور دوسروں نے بھی ان کو ڈرایا کہ اگر یہ قادیان پڑھنے گیا تو پھر واپس نہ آئیگا اور تمہارے کام کا نہ رہے گا۔ وہاں جو بھی جاتا ہے اس پر ایسا جادو کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کر وہاں کا ہی ہو رہتا ہے۔

والدہ صاحبہ اس پر گھبرا بھی جاتیں کیونکہ والد صاحب کی وفات کے بعد ان کی ساری امیدیں مجھ سے وابستہ تھیں۔ لیکن میری تعلیم کی خاطر اور یہ تسلی دلانے پر کہ قادیان میں اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے اور ماں باپ کی فرمانبرداری سکھائی جاتی ہے، انہوں نے مجھے وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ تایا صاحب اگرچہ راضی نہ تھے لیکن خاموش رہے اور کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی اور میں جون ۱۹۱۱ء کی ۱۰ تاریخ مرزا محمد اشرف صاحب کے ہمراہ قادیان روانہ ہو گیا اور ۱۱ جون کو ہم وہاں پہنچ گئے۔

جناب مرزا صاحب نے وہاں میرے لئے کوشش کی کہ قرض حسنہ کے طور پر کچھ وظیفہ لگ جائے اور میں تعلیم جاری رکھ سکوں مگر اس میں

کامیابی نہ ہوئی - زیادہ سے زیادہ یہ صورت پیدا ہوئی کہ کارپینٹری (CARPENTARY) کا کام ایک مستری سے سیکھنے کے لئے مجھے دس روپیہ وظیفہ دیا جا سکتا تھا اور مولوی محمد علی صاحب نے یہ منظور بھی کر لیا۔ اور صدر انجمن احمدیہ میں ریزولیشن پاس کرا دیا - مگر یہ کام مجھے قطعاً پسند نہ تھا - اس لئے باوجود مرزا صاحب موصوف کی تحریک کے میں نے انکار کر دیا، اور تعلیم پانے کی کوئی صورت پیدا ہونے کا منتظر رہا۔ میں سکول میں داخل ہو گیا، رہائش میری مرزا صاحب موصوف کے پاس تھی، بھلا مُرا اُن کا کھانا پکا دیتا، اور ان کی انتہا درجہ کی مجھ پر نوازش تھی کہ اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے اور اپنے بچوں جیسا سلوک کرتے، مگر اس طرح میں پڑھائی نہ کر سکتا اور پریشان رہتا - معلوم نہیں کیوں؟ پھر یہ صورت پیدا ہو گئی کہ لنگر خانہ سے کھانا ملنے لگا اور اس طرح میں نے کچھ عرصہ گزارا - لیکن یہ کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا - اکثر اوقات سخت دقت پیش آتی - آخر مجبور ہو کر مجھے بادلِ ناخواستہ سکول کی پڑھائی ترک کر دینی پڑی اور پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ میرے لئے ساری عمر حیرت کا موجب رہا اور اسے یاد کر کے لطف حاصل کرتا ہوں بات یہ ہوئی کہ میں اس گلی میں سے جو مسجد اقصیٰ سے احمدیہ چوک کو آتی ہے بند بازار کی طرف کوئی سودا خریدنے کے لئے جا رہا تھا - جب میں اس دو منزلہ

کسی وقت جاتا ضرور تھا مگر یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ حضورؓ از خود ادنیٰ لوگوں اور چھوٹوں کے ساتھ نہایت تواضع اور التفات سے گفتگو فرماتے اور بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں میری جرأت نہ ہوتی کہ میں بھی کچھ عرض کروں یا حضورؓ کے سامنے ہی ہو کر بیٹھوں۔ کوئی ایسا وسیلہ نہ رکھتا تھا کہ حضورؓ سے تعارف کرا لیتا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ حضورؓ نے پہلے کبھی میری شکل تک نہ دیکھی تھی مگر باوجود اس کے مجھ پر جو شفقت فرمائی اس کا اندازہ لگانے میں میں ساری عمر ہی قاصر رہا۔

افسوس! کہ اس کا کچھ بھی اثر اس شخص پر نہ ہوا جو اس وقت سلسلہ کے اموال اور نظام کا کاروبار سپرد کیا ہوا تھا اور اس وقت بھی حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ تھا یعنی مولوی محمد علی صاحب باوجود کئی بار کی جدوجہد کے انہوں نے میرے لیے معمولی سا وظیفہ بھی بطور قرض حسنہ منظور نہ فرمایا۔ اور مجھے اس بیکسی کی حالت میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کی کوشش کرنی پڑی۔

خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے قادیان میں دینی اور دنیوی لحاظ سے جو کچھ عطا فرمایا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور جو کبھی میرے قیاس میں نہ آیا تھا

۱۹۱۱ء کے اگست یا ستمبر میں جبکہ سکول میں موسمی تعطیلات ہو گئیں میں والدہ ماجدہ سے ملنے وطن آیا۔ وہ بہت خوش ہوئیں کہ قادیان مجھے ایسا
نہ آنے اور رشتہ داروں سے تعلق نہ رکھنے کے متعلق لوگ جو باتیں کہتے

تھے وہ غلط ثابت ہوئیں۔ اس وقت تک میں نے بیعت نہ کی تھی کیونکہ ابھی بچپن تھا اور ضروری مسائل نہ سمجھ سکتا تھا۔ والدہ ماجدہ کو یہ بھی اطمینان ہوا کہ کسی عجیب و غریب طریقہ سے مجبور کر کے کسی کو احمدی نہیں بنایا جاتا جیسا کہ عوام میں مشہور تھا۔

چھٹیاں ختم ہونے پر میں پھر قادیان چلا گیا لیکن نہایت مضمحل کیونکہ تعلیم جاری رکھنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس وقت تایا صاحب نے زادِ راہ کو کسی شکل سے مہیا کر کے عنایت فرمایا اس کا اثر اور تایا صاحب کے حسنِ سلوک نے مجھے پہلے سے بھی زیادہ ان کا گرویدہ بنا دیا۔ قادیان میں تعلیم کے متعلق مجھے جو صورت پیش آئی اس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ اب قبولِ احمدیت کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں:

قبولِ احمدیت

احمدیت سے اُنس میرے دل میں بچپن سے ہی تھا جو مرزا محمد افضل صاحب کی صحبت کا اثر تھا۔ وہ میری عمر یا اہلیت کے پیشِ نظر چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے بتاتے رہتے۔ جماعت کے حالات سناتے اور جیسے دوریشاں خلیل الرحمٰن صاحب جو ان کے ماموں زاد بھائی تھے (یہ مخلص احمدی اور دیندار بزرگ تھے آخر ہجرت کر کے قادیان چلے گئے تھے انہوں نے اپنا مکان بنالیا اور وہیں فوت ہو کر مقبرہ بہشتی میں دفن ہوئے) آپس میں اکثر جماعت احمدیہ اور قادیان کے متعلق والہانہ گفتگو کرتے تو مجھے بہت مزا

آتا اور جماعت احمدیہ کی محبت میرے دل میں چٹکیاں لینے لگتی۔ اور جب خدا تعالیٰ نے چھوٹی سی عمر میں باوجود حالات کی ناموافقت کے میرے لئے قادیان جانے کا موقع پیدا کر دیا تو میں اس پر بہت خوش تھا، لیکن باوجود اس کے خواہش تھی کہ احمدیت کے مسائل سمجھ کر اور دیکھ بھال کر بیعت کروں۔

جب میں پہلی دفعہ قادیان پہنچا تو مجھے خوب یاد ہے کہ یہ مجھے بہت عجیب سا لگا تھا: ایک تو عمر کے لحاظ سے، دوسرے اس وجہ سے کہ ایک ایسے گاؤں سے اٹھ کر گیا تھا جو شہری ماحول سے دور، بالکل سادہ زندگی رکھتا تھا۔ تیسرے اس لئے کہ عوام سے قادیان کے متعلق عجیب و غریب قصے سنتے ہوئے تھے۔ ان حالات میں پہلے پہل میں عجیب و غریب باتیں دیکھنے کا خواہش مند تھا، مگر باوجود تجسس کے کوئی ایسی بات سننے یا دیکھنے میں نہ آئی۔ اس کی بجائے جو کچھ مجھے نظر آیا وہ یہ تھا کہ چھوٹے بڑے سب پڑھنے پڑھانے میں مصروف دکھائی دیتے۔ مسجدوں میں، مدرسوں میں، گھروں میں، دکانوں میں قرآن کریم بڑی کثرت سے پڑھا اور پڑھایا جاتا۔ آپس میں بڑی محبت اور پیار کا اظہار کیا جاتا۔ چھوٹے نہایت مؤدب تھے اور بڑے نہایت مشفق۔ چھوٹائی اور بڑائی کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اور کو اور خلیفہ وقت کا دربار بھی ہوتا تو ہر شخص ایک ہی قسم کے فرش پر جہاں جگہ ہوتی اور جہاں جی چاہتا بیٹھ سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے احمدیہ محلے میں ایک ہی خاندان اور ایک ہی گھرانے کے لوگ آباد ہیں جو آپس میں ایسا قریبی اور گہرا تعلق رکھتے ہیں جو کسی ایک ہی گھرانے کے لوگ

یہیں میرے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

میں جو بالکل نووارد دیہاتی رنگ ڈھنگ کا لڑکا تھا کسی سے کوئی تعارف نہ رکھتا تھا۔ نہ کوئی میرا عزیز اور بزرگ سلسلہ کی کسی خدمت پر مامور تھا کہ اس کی وجہ سے میں کسی کی ہمدردی اور نوازش جذب کر سکتا۔ نہ مجھ میں کوئی ذاتی خوبی تھی اور نہ ہی میری حالت ایسی تھی کہ میں کسی خوشحال خاندان کا فرد سمجھا جاتا۔ اول تو مجھے ایسے ماحول میں بات چیت کرنے کا سلیقہ ہی نہیں تھا، دوسرے میں طبعاً کم گو تھا کہ کسی سے دوستی پیدا کرنا اور اپنا ہمدرد بنانا مجھے نہ آتا تھا۔ مگر باوجود ان حالات کے بستی سے ایسے کو عشق رشد لیے اوپر مہربان اور ہمدرد ہو جاتا۔

ان اصحاب کو جو وہاں اچھا وقار اور عزت رکھتے تھے اور سلسلہ کے کاموں اور خدمت گزار رکھتے، ان میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو کہ آ... نشست مرزا محمد اشرف صاحب کے ہاں تھی جن کے پاس میں رہتا تھا، اور جہاں بعض وقت گزرتا تھا باوجود کوئی خوبی نہ رکھنے کے میرے شفیقوں اور مہربانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان حالات میں مجھے اپنے حقیقی عزیز اور رشتہ دار بھی ملنے لگے اور قادیان کی محبت، وطن کی کشش اور محبت کی جگہ لینے لگی۔

انہی ایام کا ایک واقعہ مجھے ساری عمر نہیں بھولا اور وہ یہ ہے کہ پیر محمد یوسف صاحب جو کشمیر کے رہنے والے تھے مفلوک الحال اور اوائل عمر میں قادیان آ گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ نے چند اچھے

دے کر ایک معمولی سی دکان لکھنؤ کھلوا دی جس نے کافی ترقی کی، پھر دکان کو چھوڑ کر بھٹہ جاری کیا۔ بہت ترقی کی، انکی شادی ہوئی اور انہوں نے دعوتِ ولیمہ میں مجھے بھی بلایا۔ یہ پہلی دعوت تھی جو قادیان میں مجھے نصیب ہوئی۔

بیعت دوسری دفعہ جب میں قادیان پہنچا تو اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ ایک منہ زور گھوڑے سے گر پڑے اور سر میں سخت چوٹ آئی جس کی وجہ سے بہت علیل ہو گئے۔ اسی دوران میں جلسہ سالانہ آ گیا اور آپ نے باوجود ضعف علالت کے مدرسہ احمدیہ کے صحن میں نہایت خفیف آواز سے تقریر فرمائی جسے شیخ یعقوب علی صاحب ایڈیٹر الحکم دہرا کر مجمع کو سناتے رہے۔ اور آخر میں بیعت ہوئی۔ اس وقت تک عمر کی کوتاہی اور علم کی کمی کی وجہ سے پوری طرح مسائل کی تو کچھ ایسی سمجھ نہ آئی تھی۔ لیکن قادیان کی اعلیٰ طرزِ زندگی اور اہلِ قادیان کی غیر معمولی خصوصیات اور طریق عمل میرے دل میں گھر کر چکا تھا۔ بنا بریں میں نے یہ خیال کر کے کہ مبادا حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کی بیعت سے بھی محروم رہ جاؤں۔ بیعت کر لی تا کہ بعد میں مسائل اور احمدیت کی خصوصیات سمجھ میں آئیں تو بہ افسوس رہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا خدا تعالیٰ نے جو موقعہ عطا فرمایا تھا اس سے بھی محروم رہ گیا۔

قادیان میں پہلی ملازمت

سکول میں تعلیم پانا تو بعض مشکلات کی وجہ سے چھوڑ چکا تھا۔ اِدھر اُدھر سے کچھ پڑھنا شروع کیا اور دینی تعلیم پانے کا کافی موقعہ مل گیا۔ چونکہ اپنے اخراجات چلانے کی ضرورت اس حالت میں بھی لاحق تھی اس لئے کوئی چھوٹا موٹا کام کر لینے کی تلاش بھی رہی۔ ان دنوں دفتر تشحیذ الاذہان میں جہاں لائبریری تھی اور اخبارات پڑھنے کو مل جایا کرتے تھے۔ اکثر جایا کرتا اور اخبارات پڑھنے کی کوشش کیا کرتا۔

انہی دنوں دفتر تشحیذ الاذہان میں کچھ تغیرات ہوئے۔ حافظ عبدالرحیم صاحب مالیر کوٹلوی رسالہ کے ایڈیٹر اور منیجر تھے مگر چھوٹا موٹا کام بھی وہ خود ہی کر لیا کرتے تھے۔ ان کو فارغ کر دیا گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ معمولی کام کاج کرنے کے لئے کسی کو رکھنے کی گنجائش ہے۔ اس پر میں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ مجھے سات روپے ماہوار پر رکھ لیا گیا۔ اور مجھے تھوڑا بہت دفتری کام کا تجربہ ہونے لگا۔

اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ دفتر ریویو آف ریلیجنز "اردو" میں ایک مستقل کلرک کی ضرورت ہے۔ میں نے مرزا محمد اشرف صاحب کے ذریعہ اس کے لئے کوشش کی اور میں کامیاب ہو گیا اور غالباً بارہ روپے ماہوار پر مجھے رکھ لیا گیا۔ ہوا یہ کہ اس دفتر میں

پہلے تو مجھے چیٹیں بنانے اور معمولی خط و کتابت کرنے کے کام پر لگایا
لیکن جب تین کچھ چل نکلا تو جو کام میرے سپرد ہوا اس پر بھی حافظ
عبدالرحیم صاحب رہ چکے تھے اور وہ سلسلہ کی کتب فروخت کرنے اور
ان کا حساب رکھنے کا کام تھا۔ کتب کا بہت بڑا اسٹاک تھا اور وہ
کتب فروشوں کو کمیشن پر فروخت کرنے کے لئے دی جاتی تھیں۔ ان کا
حساب درست نہ رہا۔ اور جب حافظ صاحب کو فارغ کیا گیا تو کافی
رقم ان کے ذمہ نکلی۔ حافظ صاحب اچھے تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور اچھی
خاصی عمر کے تھے، کافی عرصہ سے قادیان میں رہتے تھے۔ جب مجھے
یہ معلوم ہوا کہ انکی یہ حالت ہوئی تو میں بہت گھبرایا۔ خاص کر اس
وقت جب حافظ صاحب کو کہتے سنا کہ یہ ایسا الجھن کا کام ہے کہ اپنے سے
سے ڈالے بغیر بچ نہیں سکتا۔ چنانچہ ان سے پہلے جو صاحب تھے ان کو بھی
کچھ نہ کچھ ڈالنا پڑا تھا۔ اس لئے میں نے یہ کوشش کی کہ یہ کام میری
ناتجربہ کاری، اوائل عمر اور تعلیمی کمی کی وجہ سے میرے سپرد نہ کیا جائے
مگر شنوائی نہ ہوئی الامر میں کسی بڑی مشکل میں پڑنے اور اس سے زیادہ
بدنامی سے بچنے کے لئے کام چھوڑ دینے کے لئے تیار ہو گیا۔

خدا تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے حضرت مرزا محمد اشرف صاحب کو
کہ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور بتایا کہ مشکلات کو عبور کر کے ہی انسان
ترقی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے یہ کام بھی اپنے ذمہ لے لیا۔
اور محض خدا تعالیٰ کے فضل سے عمدگی سے چلایا۔ اور جب کافی عرصہ کے

بعد مولوی صدر الدین صاحب اسسٹنٹ سیکرٹری صدر انجمن احمدیہ نے معائنہ کیا تو میرا حساب بالکل صاف نکلا۔ اور جس نئے ڈھنگ سے میں نے حساب رکھا تھا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ چونکہ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے، اس لئے معائنہ کے دوران ہی انہوں نے کہہ دیا کہ میں اسے ہائی سکول کے دفتر میں لینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ چند ہی روز بعد میرے تبادلہ کا حکم آ گیا اور مجھے وہاں بھیج دیا گیا۔

ہائی سکول میں اگرچہ میرے لئے مزید تعلیم پانے کی بھی بہت سی آسانیاں میسر تھیں لیکن کم سن لڑکوں سے میل ملاپ میرے لئے تو بوجھ تھا۔ کام کو بھی میں نے اپنی سمجھ اور علمیت سے بالا سمجھا اس لئے میں بہت جلد گھبرا گیا۔ مولوی صدر الدین صاحب ایک جلسہ میں شمولیت کے لئے الہ آباد گئے ہوئے تھے اور مولوی محمد الدین صاحب ہیڈ ماسٹر تھے میں نے استعفا لکھ کر انکی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے بڑی ہمدردی اور محبت سے سمجھایا کہ استعفا نہ دو۔ کام میں تم کو بہت جلد سکھا دوں گا، اور یہاں رہ کر تعلیم پانے اور ترقی کرنے کا تمہارے لئے بہت اچھا موقعہ ہے۔ اسے ضائع نہ کرو۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں جب قادیان آیا تھا تو میں نے بھی یہی کام کیا تھا اور ساتھ ہی تعلیم بھی پاتا رہا۔ اب اسی سکول میں سیکنڈ ماسٹر ہوں۔

آخر جب انہوں نے دیکھا کہ انکی نصیحت کا مجھ پہ اثر نہیں ہو رہا تو یہ فرما کر بات کو ٹال دیا کہ میں تو ہیڈ ماسٹر نہیں ہوں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب جب

آنے تک تم ٹھیر جاؤ۔ ان کے آنے پر ہی استعفیٰ منظور ہو سکے گا۔ لیکن میرا اِدھر تو اس کام سے دل اُچاٹ ہو چکا تھا اور اُدھر حضرت نواب محمد علی خانصاحب کے ایک ملازم نے خدا تعالیٰ ان پر رحم کرے جو حضرت نواب صاحب کی مالیر کوٹلہ کی جاگیر کے مختار تھے اور لدھیانہ میں رہ کر کاروبار کرتے تھے، مجھے ایسے رستہ پر ڈال دیا جو نوکری کے وقت بہت خطرناک ہوتا ہے، اور مجھے یہ توقع بھی دلائی کہ وہ میری ملازمت اور آئندہ ترقی کا بہت اچھا انتظام کر دیں گے۔ اس وجہ سے میں استعفیٰ کی منظوری کا انتظار کئے بغیر ہی لدھیانہ چلا گیا۔ مگر باوجود اس کے قادیان کے مولوی صدرالدین صاحب نے صدر انجمن سے میرا استعفیٰ منظور کرا دیا۔ اور جتنے دن میں نے کام کیا تھا اس کی تنخواہ لدھیانہ بھجوا دی۔

لدھیانہ میں رہائش

لدھیانہ میں میری رہائش اور خوراک وغیرہ کا تو بہت اچھا انتظام تھا۔ وہاں مجھے چند احمدی احباب کی شفقت اور نوازش بھی حاصل ہو گئی جن میں سے شیخ محمد شفیع صاحب سیکرٹری جماعت احمدیہ لدھیانہ۔ چوہدری ضیاء الدین صاحب مختار (جو جگراؤں کے ایک اچھے گھرانے کے فرد تھے، اور قادیان میں کافی عرصہ رہ چکے تھے، بڑے مخلص اور دیندار احمدی تھے)۔ اور مولوی عبدالصمد صاحب محمد شریف

خانصاحب یہ سی آئی ڈی میں سب انسپکٹر تھے، اور سرحد کے
رہنے والے تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر جس ملازمت پر صاحب
موصوف مجھے لگانا چاہتے تھے وہ مجھے پسند نہ آئی۔ جاگیر سے
متعلق مقدمات کی وہ بطور وکیل ریاستی عدالت عالیہ میں پیروی کرتے۔
اپنے کام میں بہت ہوشیار اور تجربہ کار شخص ہونے کی وجہ سے ریاستی
اہلکاروں کے علاوہ والئ ریاست تک انہوں نے رسائی حاصل کر لی تھی، اور
بہت اعتبار جما لیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے حضرت نواب صاحب
اور والئ ریاست مالیر کوٹلہ کی انہیں بہت سی الجھنیں اور مشکل جھیل
دور کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی، اور بہت اچھے تعلقات پیدا
کر لئے۔ حتیٰ کہ حضرت نواب صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب
حبیب الرحمٰن صاحب کی شادی نابھہ ریاست کی صاحبزادی سے ہوئی۔ بہرحال
میں ان کے ساتھ عدالتوں میں جاتا مگر وہاں جس رنگ ڈھنگ سے
کام ہوتا اسے دیکھ کر طبیعت پر بوجھ پڑتا اور طبیعت اسے ذریعہ
معاش قرار دینے کی طرف قطعاً مائل نہ ہوتی۔

انہی ایام میں مجھے لاہور سے "پیغام صلح" کی ایک چٹھی پہنچی
جس میں لکھا تھا کہ اگر آپ پیغام صلح میں کام کرنا پسند کریں تو جلد سے
جلد تشریف لے آئیں ورنہ جواب بھیج دیں۔

چونکہ مضمون نویسی سے مجھے دلچسپی تھی اور پیغام صلح میں
بھی میرے چند مضامین شائع ہو چکے تھے، اس لئے میں نے سمجھا کہ

اب ان لوگوں نے مجھے خود بلایا ہے تو وہاں کام پر لگ جانا میرے لیے
بہت ممکن ہوگا۔ چنانچہ میں لاہور پہنچ گیا۔ مگر جب وہاں جا کر دیکھا کہ نہ
کوئی باقاعدہ دفتر نہ کوئی سوسائٹی، نہ احمدیت کے متعلق کوئی بات
چیت، تو سخت حیرت ہوئی۔ پھر جو شخص بھی نظر آتا رعونت کا پتلا
معلوم ہوتا۔ جن لوگوں کی گفتگو سننے کا موقعہ ملا ان میں اخلاص اور
محبت کی بجائے پر اسرار رنگ نظر آتا۔ میں پیغمبر صاحب سے ملا اور ان
کا خط پیش کیا مگر وہ ایک غلط انداز نگاہ ڈال کر کسی شغل میں
مصروف رہے۔ آخر میں رات اک کمرے میں بسر کی جس میں وہ بیٹھے
تھے۔ صبح اٹھا تو ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ
اس وقت کسی مریض کو دیکھنے کے لیے تانگہ پر جانے والے تھے انہوں
نے مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ نہ کچھ پوچھا نہ میں نے بتایا۔ واپس آکر
انہوں نے مینیجر صاحب سے کچھ کہا۔ انہوں نے مجھے آمد و رفت کا کرایہ
دیا۔ میں جان بچی لاکھوں پائے کہتا ہوا واپس آگیا۔

معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے میرے مضامین پڑھ کر میرے
متعلق ایسا نقشہ کھینچا جو اصل کے بالکل خلاف تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ
کوئی معمر اور تجربہ کار انسان ہوگا کیونکہ ذاتی طور پر میرے واقف نہ تھے
لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میں بالکل نوعمر لڑکا ہوں اور ان کی قیاس آرائی
غلط نکلی تو انہوں نے مجھے کسی مصرف کا نہ خیال کیا۔

مدرسہ واپس آکر میں نے اسی مخمصہ میں دن گزارے کہ مجھے اشد

زندگی کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہیئے۔ مگر اس کام کے متعلق ایک
لفظ نہ سیکھا جس کے پیش نظر میں یہاں آیا تھا۔ جیسا کہ میں ذکر کر
چکا ہوں وہاں مجھے کافی آرام و آسائش حاصل تھی، اور مجھے وہاں پڑے
رہنے میں کچھ مشکل نہ تھی۔ لیکن بیکار زندگی گزارنا اور آئندہ زندگی کے لئے
کامیابی کی کوئی کرن نظر نہ آنا مجھے بہت شاق تھا۔ اور یہی سلسلہ بیچین سا رہتا
حتیٰ کہ یہ سلسلہ بیچینی انتہا کو پہنچ گئی اور میں چپ چاپ کچھ کہے سنے
بغیر ایک دن روانہ ہو کر پھر قادیان پہنچ گیا۔

منشی احمد دین صاحب کے حالات

جن صاحب کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان کا نام منشی احمد دین
تھا۔ گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے کہ حضرت نواب صاحب کے ملازم
ہو کر مدت سے یہیں رہتے تھے۔ یہ بڑے شائق تھے اور مہمان نواز تھے بنا سی
عمر جو کچھ کمایا خرید کتب اور مہمان نوازی میں اٹھا دیا۔ نہ صرف سلسلہ احمدیہ
کی کتب اور ہر ایڈیشن کی ان کے پاس موجود تھیں، بلکہ مخالفین
احمدیت کی کتب کا بہت سا ذخیرہ بھی ان کے پاس تھا اور یہی کتب
انکی پونجی تھی۔

مہمان نوازی مقدور سے بڑھ کر کرتے تھے۔ نہ صرف دن بلکہ
رات کے کسی حصے میں بھی کوئی مہمان آجاتا تو اس کے سامنے تازہ کھانا
پیش کرتے۔ انکی ایک لڑکی جو انکی خدمت غیر معمولی محبت اور سرگرمی

سے کرتی۔ ہر وقت اس بات کا اہتمام رکھتی کہ جس وقت کوئی مہمان آئے تا زہ کھانا تیار کر کے دے سکے۔ بعض اوقات میں نے دیکھا کہ گھر کا زیور تک۔ بیچ کر مہمان کی خاطر تواضع کی جاتی۔

جبتک کاروبار کرتے رہے اچھی آسودہ زندگی بسر کرتے رہے اور فکر فردا سے کلیۃً غافل رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کبر سنی اور خدمتگذاری کے باوجود حضرت نواب صاحب کے کسی لڑکے نے ایک مجلس میں ان کے منہ پر جوانی کے جوش میں طمانچہ دے مارا۔ تو انہوں نے سخت کبیدہ خاطر ہو کر ملازمت چھوڑ دی۔ اس وقت ان کے پاس چند روز کا گذارہ چلانے کے لئے بھی کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد جتنا عرصہ بھی جئے نہایت عسرت میں رہے۔ آخر ۱۹۰۸ء میں وہ فوت ہو کر وہیں دفن ہوئے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرَّاحِمِیْنَ ۔

مضمون نویسی کی ابتدا

مجھے اخبار پڑھنے کا چسکہ تو اسی وقت پڑ چکا تھا جب میں تشحیذ الاذہان میں کام کرنے لگا تھا۔ اور جب میں ریویو آف ریلیجنز کے دفتر میں گیا تو بھی دلچسپی جاری رہی بلکہ بہت بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اب مجھے مضمون نویسی کا شوق بھی دامنگیر ہونے لگا۔ اس وقت تک مکرم شیخ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر اخبار نور سے بھی واقفیت

پیدا ہو چکی تھی اور وہ بھی مجھے مہربانی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چھوٹی
موٹی کتب کے مطالعہ کے سلسلہ میں جب میں نے مہابھارت کا اردو
ترجمہ پڑھا تو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کتاب کی بنا پر ایک مضمون
لکھنے کی کوشش کی۔ یہ میری بالکل پہلی اور ابتدائی کوشش تھی۔ میں
نے مضمون مکرم شیخ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا اور میری خوشی
کی انتہا نہ رہی جب مکرم شیخ صاحب نے اسے پسند فرمایا اور اپنے اخبار
میں چھاپ دینے کا وعدہ فرمایا۔

اُس وقت ان کا اخبار ہفت روزہ تھا اور لاہور میں
چھپتا تھا۔ وہ اخبار کی کاپیاں لکھوا کر لاہور بھیج دیتے اور وہاں اخبار
چھپ کر بذریعہ ریلوے پارسل بٹالہ آتا اور وہاں سے قادیان منگوا
لیا جاتا تھا۔ جب میرا مضمون کاپی ہو کر لاہور بھیجا گیا تو مجھے اسے چھپا ہوا
دیکھنے کی خواہش لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جب مقررہ
وقت تک چھپ کر نہ آیا اور مکرم شیخ صاحب نے پریس والوں سے اس
کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے لکھ دیا کہ ہمیں کاپیاں نہیں پہنچیں۔
اس پر شیخ صاحب کو دوبارہ اخبار لکھنا پڑا۔ چونکہ کاپیوں کے ساتھ
ہی مضمون کے مسودے بھی پریس میں بھیج دیے جاتے تھے اس لئے
وہ بھی ضائع ہو گئے۔ چونکہ میرے مضمون کا مسودہ بھی انہی میں تھا۔
اس لئے مجھے سخت صدمہ ہوا اور یہ بڑا شاق گزرا۔ جناب شیخ صاحب
کے کہنے پر میں نے دوبارہ وہی مضمون لکھا، کیونکہ اس کے نوٹ میرے

پاس موجود تھے اور خدا تعالیٰ کے فضل سے پہلے کی نسبت اچھا لکھا گیا اور "مہابھارت کا ایک ورق" کے عنوان سے چھپ گیا۔ اس کے دو نمبر میں نے اور لکھے اور وہ بھی چھپ گئے۔

چونکہ مضمون نویسی کے لئے میری یہ پہلی کوشش تھی اس لئے میں نے اس خیال سے کہ میری حالت کو پیش نظر رکھ کر مضمون کو نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ مضمون کو مضمون سمجھ کر پڑھا جائے مضمون کے ساتھ اپنا نام نہ لکھا بلکہ صرف "غ۔ ن۔ بلانوی" لکھا۔ ان مضامین کے شائع ہونے پر میرا حوصلہ بڑھ گیا، اور میں نے اس طرف زیادہ توجہ دینی شروع کر دی۔

اخبار "نور" میں میرے چند اور مضامین بھی شائع ہوئے۔ ایک مضمون اخبار "کشمیری میگزین" لاہور میں چھپا جو "کشمیری" لفظ کو بطور قومیت استعمال کرنے کے خلاف تھا۔ دو مضمون اخبار "افغان" پشاور میں شائع ہوئے، جن کا عنوان "مسلمان کیونکر ترقی کر سکتے ہیں" تھا۔ دو تین مضامین "پیغام صلح" لاہور میں شائع ہوئے۔ یہ سب مضامین میں نے جلد کرا کر محفوظ رکھے ہوئے تھے بطور ابتدائی مضمون نویسی کی یادگار کے، کہ قادیان بھی انقلاب کی زد میں آ گیا اور ہمیں نہایت ہی بے سروسامانی کی حالت میں اپنے گھروں سے نکلنا پڑا۔ اسی حالت میں وہ مجموعہ مضامین بھی دوسری یادگار تحریروں سمیت وہیں رہ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

پایہ رکھتے تھے۔ ساری عمر آپ نے خدمتِ اسلام میں تحریری اور تقریری رنگ میں صرف کر دی۔ گورمکھی تو آپ ابتدا ہی سے جانتے تھے، اس میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا جو سکھوں میں بہت مقبول ہوا اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ہندی آپ نے خود مطالعہ سے پڑھی اور اس میں بھی قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ اس کی بھی بہت قدر ہوئی۔ ان دونوں زبانوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سوانح بھی مرتب فرمائی۔ اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں غرض بہت معمولی حالات سے اور کوشش کے ذریعہ غیر معمولی ترقی اور آسودگی تک پہنچے۔

میں جب ۱۹۱۷ء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے قادیان پہنچا تو اس کس مپرسی کے دور میں نہ جانے کس طرح مگر آپ سے تعارف ہوگیا۔ آپ میرے اُن چند محسنوں اور مہربانوں میں سے ایک تھے جو محض للہ مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ میں نے ان سے بھی کچھ نہ کچھ سیکھا اور دینی اور دنیوی لحاظ سے بہت فائدہ اٹھایا۔ میں نے اس زمانہ میں سب سے پہلا مضمون انہی کی حوصلہ افزائی پر لکھنے کی جرأت کی اور انہوں نے اپنے اخبار میں "مہابھارت کا ایک ورق" کے عنوان سے شائع فرمایا۔ پھر اس کا دوسرا اور تیسرا نمبر بھی شائع کیا۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ میں نے اپنے مضمون کے ساتھ اپنا نام لکھنے کی بھی جرأت نہ کی صرف غ۔ ف بلانوی لکھا۔ اس کے بعد آپ نے میرے کئی مضامین اور نوٹ شائع کئے، اور معمولی رسمی تعارف مخلصانہ دوستی میں بدل گیا

جو آخری وقت تک قائم رہا مگر آخری وقت شکل دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ انقلاب کے بعد کئی بار جلسہ میں ملے اور ہر بار ممکن امداد پر آمادگی کا حسب معمول اظہار کیا۔

آپ بڑے ہمارے مستقل مزاج، انتہائی محنت اور مشقت کے عادی اور شفقت کرنے والے دوست تھے۔ جب میرے سپرد آفس کا کام ہوا تو بہت خوش ہوئے اور مذاق کے رنگ میں فرمایا جیسے لوہے کی پرانی بیماری کی تھی۔ الحمد للہ اس کے زنگ پگھلنے کے دن آ گئے۔ جوں جوں دن تھیں سال گزرتے گئے میری پہلی طالت کو فراموش کر کے اچھے خاصے مزاح بن گئے۔ بار ہا میرے کمرہ ۵۵ نمبر کو ملاقات کا ذریعہ قرار دے کر تشریف لے آتے اور نہایت لطیفوں سے محظوظ کرتے

انقلاب نے کسی کو کہیں کا نہیں رکھ دیا لیکن جماعت نے بزرگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کے نادر اور قیمتی رسالہ جس سرعت کے ساتھ چھاپ کر کتاب میں ہر زندہ دل کے لئے بہت بڑی خوشی کا موجب ہے۔ اور مزید صدمہ اس بات کا ہے کہ جانے والے اپنے بہت سے مخلص دوستوں سے بھی منہ چھپائے چلے جاتے ہیں اور ان کو آخری ملاقات کا موقعہ میسر نہیں آتا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

یہ غم اور صدمات بروز حشر ہی دور ہوں گے اگر ہم اس قابل سمجھے گئے۔

خاکسار غلام نبی

انہی ایام میں جبکہ میں یہ چھوٹے موٹے مضامین لکھ رہا تھا اور اخباروں میں شائع ہو رہے تھے، اس وقت میں بطور کلرک ریلوے آفس ایگزیمنر (اردو) میں کام کرتا تھا۔ مولوی ظفر علی صاحب کا اخبار "زمیندار" جسے وہ خود ایڈٹ کرتے تھے، اور مولوی ابوالکلام آزاد کا اخبار "الہلال" جو تازہ تازہ ہفتہ وار نکلنے لگا تھا، اور امرتسر کا اخبار "وکیل" مولوی عبداللہ صاحب منہاس کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا مسلمانوں کے برسرآوردہ اور اعلیٰ پایہ کے اخبار تھے۔ میں ان کو بڑے شوق سے پڑھا کرتا اور ان کی طرز کی عبارت لکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

انہی دنوں اخبار "الفضل" بڑے اہتمام سے نکلنا شروع ہوا تھا جس کی خاص عنان ادارت حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ہاتھ میں تھی اور کئی اور صاحب قلم مستقل عنوانات پر مضامین لکھنے پر مقرر تھے جن میں قاضی محمد ظہورالدین صاحب اکمل کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ اور مضمون نویسی کے سلسلہ میں ان کی شاگردی میرے لئے وجہ افتخار تھی۔ ان کی امداد سے میں نے "الفضل" کے لئے ایک مضمون بڑی محنت اور کوشش سے لکھا جس میں جناب قاضی صاحب نے مدد فرمائی۔ مضمون مکمل ہو گیا تو حضرت صاحب چند روز کے لئے شملہ تشریف لے گئے اور جناب قاضی صاحب کو "الفضل" کا انچارج مقرر فرما گئے۔ انہوں نے میرا مضمون کاتب کو لکھنے کے لئے دے دیا۔ اور کاتب نے نصف سے زیادہ لکھ بھی لیا کہ میری بدقسمتی سے شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی ایڈیٹر "الحکم" کی نظر اتفاقیہ اس پر پڑ گئی اور انہوں نے

اس سے صرف یہی نہیں کہ مضمون ناقابلِ اشاعت تھا اور اس میں کوئی ایسا نقص تھا جو "الفضل" کی پالیسی کے خلاف تھا قاضی صاحب کو نوٹ کر دیا کہ حضرت صاحب کی تشریف آوری تک اسے روک لیں اور آپ منظور فرمائیں تو شائع ہو۔ جب آپ تشریف لائے تو شیخ صاحب نے نہ معلوم کیا کچھ کہہ کر مضمون کو شائع نہ ہونے دیا اور نامنظور کرا دیا۔ مضمون کوئی اس پایہ کا تو تھا نہیں کہ اس کی اشاعت ضروری سمجھی جاتی ایک عام مضمون تھا جس میں مسلمانوں کو ایک ہاتھ پر جمع ہونے اور امام وقت کو قبول کرنے کی اہمیت بتانے کی طفلانہ کوشش کی گئی تھی کیونکہ اس وقت میں عمر اور علم کے لحاظ سے ایک معمولی طفل ہی تھا۔ ان حالات میں شیخ صاحب نے اس کی عدمِ اشاعت کی جو وجہ پیش کی وہ اس وقت کے لحاظ سے کافی وزن رکھتی تھی اس لئے وہ مضمون ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا۔

اس وقت مرکز میں مولوی محمد علی صاحب اور اُن کے ساتھیوں کا صدر انجمن میں بڑا دخل تھا جس کے سرکردہ افراد خواجہ کمال الدین صاحب مولوی صدر دین صاحب، ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب اور شیخ رحمت اللہ صاحب وغیرہ تھے۔

خواجہ صاحب اس وقت تبلیغ اسلام کے لئے لنڈن جا چکے تھے اور اُن کے طرب انگیز اور خوش کن مضامین "پیغام صلح" کی زینت بن رہے تھے۔ کچھ انگریزوں کے مسلمان ہونے اور اپنے لیکچروں کی دھاک بٹھانے کی پے در پے خوشخبریاں وہ سُنا چکے تھے۔

ایک لارڈ نے جن کا نام ہیڈلے تھا جب خواجہ صاحب کے ذریعے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو خواجہ صاحب کے مشن کی اہمیت بڑھ گئی اور غیر احمدیوں میں ان کا اثر پھیلنے لگا۔ خواجہ صاحب کا ہندوستان میں بھی طریق عمل تھا کہ وہ غیر احمدیوں میں اثر اور رسوخ حاصل کرنے کیلئے اور ان سے مالی امداد پانے کے لئے احمدیت کے مخصوص مسائل سے ہٹتے جا رہے تھے خصوصاً مسئلہ نبوت کی ایسی تاویلیں کرتے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم اور آپ کے منشاء کے خلاف تھیں۔

مولوی محمد علی صاحب کے ساتھیوں کو خواجہ صاحب کی شہرت کی وجہ سے بہت تقویت حاصل ہو چکی تھی۔ جماعت احمدیہ میں عقائد کے لحاظ سے تو نہیں لیکن شہرت کے لحاظ سے یہ لوگ بہت زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ انصار اللہ کی جو تنظیم کچھ نوجوانوں نے باغراض تبلیغ قائم کر رکھی تھی حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سے اخلاص رکھتی تھی اور مرکز میں اچھا اثر رکھتی تھی۔ عام علماء سلسلہ کی اسے حمایت حاصل تھی اور مرکزی اخبار بھی ان کے حامی تھے مگر سلسلہ کے انتظامی معاملات میں اس کا کم دخل تھا۔ مالیات اور دوسرے کاروبار میں زیادہ دخل پہلے لوگوں کا تھا۔ خزانہ پر ان ہی کا قبضہ تھا اور اخراجات ان کے قبضہ میں تھے۔

ان دونوں گروہوں کے عقائد اور تبلیغ احمدیت کے متعلق طریق میں جو اختلاف تھا وہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کئی بار کسی نہ کسی رنگ میں حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی پیش ہوا مگر آپ نے جماعت کے

اتحاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولوی محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین صاحب کے معافی مانگنے پر نرمی کا سلوک کیا اور صرف دوبارہ بیعت لینے پر ہی اکتفاء کی۔ پھر ایک مرتبہ آپ ان کے خلاف سخت کاروائی کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے معافی مانگنے پر آپ نے معاف فرما دیا۔ تاکہ جماعت کا اتحاد قائم رہے۔

میں اخبارات میں خواجہ صاحب کے چرچے پڑھ کر اور انکی شہرت اور تبلیغی مساعی کو دیکھ کر اُن کا مداح بن گیا۔ "الفضل" میں بھی ان کے لئے جو کچھ چھپتا تعریفی اور توصیفی رنگ رکھتا تھا۔ جماعت بھی انکی گرویدہ ہو رہی تھی اور دل کھول کر ان کی مالی مدد کر رہی تھی۔ ان کے اردو اور انگریزی ماہانہ رسالہ کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ البتہ مرکز میں زبانی گفتگو میں ان پر کڑی نکتہ چینی کی جاتی۔ اور جب کبھی ایسی گفتگو میں میں بھی موجود ہوتا تو میں خواجہ صاحب کی حمایت کرتا اور انکے متعلق تعریفی لفظ استعمال کرتا۔ جن میں بعض اوقات دوسرے گروہ کی تنقیص بھی پائی جاتی۔ مثلاً میں یہاں تک کہہ دیتا کہ جو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں ان کو ایسے شخص پر اعتراض نہیں کرنے چاہئیں جو اپنی چلتی ہوئی وکالت چھوڑ کر تبلیغ اسلام کے لئے ولایت جا بیٹھا ہے۔ اور جسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

اگرچہ میری اس قسم کی گفتگو بہت بے باکانہ ہوتی، اور مجھے کسی قسم کا کوئی وقار بھی حاصل نہ تھا مگر کبھی کسی موقعہ پر کوئی بدمزگی پیدا نہ ہوئی۔

حتیٰ کہ کبھی کسی نے مجھے تھوڑی بہت ڈانٹ بھی نہ پلائی بلکہ میری باتوں کو بڑی فراخدلی سے سنا جاتا اور بڑی نرمی سے گفتگو کی جاتی۔ میرا یہ رویہ "الفضل" میں میرے مضمون کی اشاعت میں مانع ہوا۔

مگر خدا تعالیٰ کی شان ستاری اور کریمی کے قربان جاؤں کہ اس نے جلد ہی مجھے نہ صرف غلط راستہ سے بچا لیا بلکہ "الفضل" کے دفتر میں پہنچ دیا اور اپنے فضل اور ذرہ نوازی سے اس قابل بنا دیا کہ وہی "الفضل" جس میں میرا ایک بھی مضمون شائع نہ ہو سکا اسی کے سارے صفحات شروع سے لیکر آخر تک اور صدی کے تیسرے حصے سے بھی زیادہ عرصہ تک مجھے اس طرح عطا کئے رکھے کہ میں جو چاہوں ان میں شائع کر سکتا تھا، اور میں نے دل کھول کر خدا تعالیٰ کے اس انعام سے فائدہ اٹھایا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! اس اجمال کی تفصیل میں انشاء اللہ اپنے موقعہ پر لکھوں گا۔ [لہ]

حاشیہ لہ: اس جگہ خطبہ جمعہ فرمودہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء بمقام ربوہ "الفضل" ۱۸ مئی ۱۹۵۶ء کا اقتباس درج کرنا موزوں رہے گا۔ (مرتب)

"نمازِ جنازہ پڑھانے سے پہلے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

"ایک جنازہ خواجہ غلام نبی صاحب سابق ایڈیٹر "الفضل" کا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ان کے ایک بیٹے نے کسی غلط فہمی کی بنا پر مجھے لکھا کہ انہیں ربوہ

انجمنِ حزب اللہ کی ممبری

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ اخبار "زمیندار" اور "الہلال" پڑھنے کا جب موقعہ ملا تو ان سے میری دلچسپی بڑھ گئی، اور میری تمنا یہ تھی کہ اس رنگ میں مجھے بھی لکھنا آجائے تب ان کے خاص خاص فقرے یاد کر لیتا اور انہیں اپنے مضامین میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا۔ میری یہ کوشش تو تکمیل کو نہ پہنچی، کیوں نہ پہنچی؟ اس کا ذکر اپنے محل پر آئیگا۔ البتہ ان ایام کا ایک خاص واقعہ قابلِ ذکر ہے، اور وہ یہ کہ "الہلال" کے ایڈیٹر مولوی ابوالکلام آزاد نے جب دیکھا کہ مسلمانوں میں ان کا اثر اور رسوخ بڑھتا جارہا ہے اور "الہلال" نے خاص وقعت حاصل کر لی ہے تو انہوں نے حزب اللہ کے نام سے ایک پارٹی قائم کرنے کا اعلان کر دیا اور

آنے کی اجازت دی جائے۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ میں نے اسی وقت جواب لکھوایا کہ ان کو ربوہ میں آنے سے ہرگز کوئی روکنے والا نہیں۔ بلکہ میں تو ان کے لئے مکان کا بھی انتظام کر دوں گا مگر اس کے بعد وہ انہیں ربوہ نہیں لائے۔ اگر وہ انہیں یہاں لاتے تو ممکن ہے ان کا علاج یہاں ہو سکتا یا ممکن ہے ان کے آخری وقت میں اگر ان کے کچھ پرانے دوست اور صحابہ وغیرہ ملتے تو یہ امر ان کے دل کے اطمینان اور تسلی کا موجب ہوتا مگر افسوس ہے کہ وہ انہیں ربوہ نہ لائے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے پھر توجہ

اس کے فارم وغیرہ چھپوا کر "الہلال" کے ذریعہ پھیلائے۔ میں نے الہلال کے
مطالعہ کے سلسلہ میں جب ان کا اعلان پڑھا اور اس کے ساتھ ہی ممبری کا فارم
چسپاں دیکھا تو شوق پیدا ہوا کہ میں بھی ان کا ممبر بن جاؤں۔ کیونکہ اس میں
لکھا تھا کہ اس حزب اللہ کے متعلق خاص خاص باتیں صرف ممبروں کو ہی
بھیجی جائیں گی اخبار میں شائع نہ ہوں گی۔ اور میں چاہتا تھا کہ دیکھوں وہ خاص
باتیں کیا ہیں۔ چنانچہ میں نے وہ فارم پُر کر کے بھیج دیا اور اس میں اپنا
نام بایں الفاظ یوں لکھا۔ "غلام نبی بلانوی"

اس وقت میرے مدنظر آخری الفاظ سے صرف یہ تھا کہ اپنے گاؤں سے
نسبت ہو۔ گو گاؤں بھی میری طرح گمنام ہی تھا لیکن بعد میں مجھے ان الفاظ
نے بہت فائدہ پہنچایا اور ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا۔

بات یہ ہوئی کہ مولانا آزاد کو اس کے سوا توفیق ہی نہ ملی کہ چند لوگوں نے

بقیہ حاشیہ

دلائی تھی کیا ابھی تک وہ انہیں کیوں نہیں لائے۔ مگر معلوم ہوتا ہے میرا
وہ خط انہیں نہیں پہنچا، اور وہ وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ انکی مغفرت
فرمائے۔ (آمین)

"الفضل" کے ابتدائی اسسٹنٹ درحقیقت وہی تھے۔ ایڈیٹر بس نام
خود بڑا کرتا تھا اور اسسٹنٹ ایڈیٹر وہ تھے۔ انکی تعلیم زیادہ نہیں تھی صرف
مڈل پاس تھے مگر بہت ذہین اور ہوشیار تھے۔ میری جس قدر
پہلی تقریریں ہیں وہ ساری کی ساری انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔

اسے ملے ۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں غلام نبی عارف نامی کوئی نہیں۔ البتہ غلام نبی ایک لڑکا ہے جو الفضل کے دفتر میں کام کرتا ہے اور اس کا مولانا آزاد سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ ان کے خلاف مضمون لکھتا رہتا ہے ۔ حسنِ اتفاق سے اُن دنوں میرے چند مضامین مولوی ابو الکلام آزاد کے ایک مضمون کے متعلق الفضل میں شائع ہو چکے تھے جو میں نے قاضی اکمل صاحب کی رہنمائی میں لکھے تھے ۔ اور گو میرا نام ان کے ساتھ شائع نہ ہوا تھا مگر ان کے اصل مسودے موجود تھے ۔ وہ انعام موعودہ اس افسر کی خدمت میں پیش کر دیئے ۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے البلاغ میں ایک سلسلہ مضامین اس موضوع پر لکھا تھا کہ انبیاء دنیا میں لوگوں کو سرکشی کرنے سے روکنے آتے ہیں اور چونکہ وہ ایسے وقت میں آتے ہیں جبکہ دنیا میں جور و ستم حد انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور اس وقت کی حکومت تمام مظالم کا منبع ہوتی ہے اس لئے نبی کا سب سے پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ حکومتِ وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور اسے مٹا کر اپنی حکومت خدا تعالیٰ کے احکام پر چلنے والی قائم کرے ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے خاص طور پر حضرت موسیٰؑ کی مثال پیش کی اور قرآن کریم کی ان آیات سے استدلال کیا جن میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے مقابلہ کا ذکر ہے ۔

میں نے اس کے جواب میں مضامین لکھے اور ثابت کیا کہ جہاں مولانا آزاد کا یہ نظریہ غلط ہے کہ نبی دنیا میں حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے آتا ہے وہاں قرآن کریم کی آیات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق

استدلال بھی غلط ہے۔ میں نے یہ ثابت کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال بھی پیش کی اور بتایا کہ ان کے متعلق خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے کہ انہوں نے صرف حکومت مصر کے خلاف کسی رنگ میں باغیانہ جدو جہد نہ شروع کی بلکہ والئے مصر سے خود کہہ کر اپنے آپ کو وزیر خزانہ مقرر فرمایا اور نہایت اعلیٰ پیمانہ پر اس عہدہ کے فرائض ادا کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مضامین اس قسم کے شبہات کو رد کرنے والے تھے کہ میرا مولانا ابو الکلام آزاد کے خیالات اور عقائد سے کوئی تعلق ہے، اور ان سے ثابت تھا کہ میں ان کے خیالات کے سخت خلاف ہوں۔ اس لئے جب یہ مضامین پولیس افسر کے پیش کئے گئے تو وہ میرے متعلق مطمئن ہو گئے اور مجھے انہوں نے اپنے پاس بلانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور چلے گئے۔

قادیان میں دوبارہ آمد

میں دوبارہ دہلی سے واپس پھر قادیان مارچ ۱۹۱۴ء کے شروع یا فروری کے آخر میں آیا۔ ان دنوں حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ سخت بیمار تھے۔ قادیان میں سخت اضطراب اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں قسم کے خیالات کے لوگوں میں جو دبا ہوا اختلاف تھا، وہ ابھرتا آرہا تھا۔ ہر شخص کا جائزہ لیا جارہا تھا۔ راز کی باتیں تو الگ رہیں، عام گفتگو بھی قابل اعتماد ہی ایک دوسرے سے کرتے، اور ہر شخص ایسی

فکر میں مبتلا نظر آتا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضؓ کی وفات کا سانحہ
المیہ کس قسم کا انقلاب برپا کرے گا۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
دن رات کی دعاؤں میں مصروف تھے اور اپنے مخلصین کو بھی دعاؤں پر
زور دینے کی تلقین فرماتے رہے حتیٰ کہ وہ المناک گھڑی آگئی جبکہ حضرت
خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ نے انتقال فرمایا۔ یہ مارچ کی ۱۳ تاریخ
اور جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کیلئے نماز ادا کرنے کے لئے لوگ مسجد اقصیٰ میں
جمع تھے کہ حضور کے انتقال کی خبر پہنچی۔

بیماری کے آخری ایام میں حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضؓ کو حضرت
نواب صاحب کی کوٹھی دار السلام لے جایا گیا تھا کیونکہ اس وقت قادیان میں
صحت کے لحاظ سے بہترین جگہ وہی تھی۔ مسجد سے لوگ غم و الم میں ڈوبے
ہوئے کوٹھی میں پہنچے اور رنج و افسوس کی تصویر بن کر جہاں کسی کو جگہ
ملی کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مفصل طور پر سلسلہ کے اخبارات
اور دوسرے لٹریچر میں درج ہے۔

چونکہ مرکزی دفاتر پر مولوی محمد علی صاحب کا کنٹرول تھا اس
لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ان کی اجازت کے بغیر بیرونی جماعتوں کو حضرت
خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع بھی دی جا سکتی۔ اور
اور یہ واقعہ میرے سامنے کا ہے کہ بیرونی جماعتوں کے پتے جس رجسٹر میں
تھے وہ مولوی محمد علی صاحب کا ایک خاص معتقد جو ان کا ہیڈ کلرک تھا
اپنی بغل میں دبائے ہوئے اس مجمع میں موجود تھا جو حضرت خلیفۃ المسیح

نماز جمعہ ادا
کر رہے تھے
قریباً ایک
بجے بعد دوپہر

اوّل رضؓ کی وفات کے معاً بعد مسجد نور میں جمع ہو گیا تھا لیکن جب رجسٹر
پہ نوٹ کرنے کیلئے اُس سے مانگا گیا تو اُس نے دینے سے انکار کر دیا
رو رہا تھا بڑے غم و الم میں گزری لیکن صبح سویرے ہی اس بات سے میرے
چھپے کہ شاید لوگوں کو بھی مولوی محمد علی صاحب کے ایک رسالہ نے سخت حیرت
میں ڈال دیا جو حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضؓ کی نازک حالت دیکھ کر مولوی
محمد علی صاحب نے آپ کی زندگی میں ہی لکھا تھا اور پوشیدہ طور پر لاہور
میں چھپوا کر رکھا اور اسی وقت شائع کر دیا جب حضرت خلیفۃ المسیح
الاول رضؓ فوت ہو گئے اور آپ کی وفات پر قادیان آئے ہوئے اصحاب میں
دوسرے اور تیسرے دن ریلوے سٹیشنوں پر رات کے وقت تقسیم کیا گیا اور انہی کے
ذریعہ رات تک ہی قادیان پہنچ گیا۔

اس رسالہ میں مولوی صاحب نے جماعت کو اپنی طرف مائل کرنے
کے لئے بہت کچھ لکھا تھا مگر ان کی جس بات نے جماعت پر خاص اثر کیا
اور جس نے مجھے صحیح راستہ دکھایا وہ یہ تھی کہ جماعت کے لئے کوئی واجب الاطاعت
خلیفہ امام نہیں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں میرا دلی رجحان
مولوی محمد علی صاحب اور انکی پارٹی کی طرف تھا باوجود اس کے کہ مولوی
صاحب نے مجھ سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ سخت نقصان پہنچایا تھا حضرت
خلیفۃ المسیح الاول رضؓ کی وفات پر میں یہ ارادہ کر چکا تھا کہ اس پارٹی میں سے
جو خلیفہ بنے گا میں اس کی بیعت کر لوں گا۔ لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ
لوگ قریباً چھ سال حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضؓ کو واجب الاطاعت خلیفہ

ماننے کے باوجود آئندہ کے لئے خلافت کے وجود کا بھی انکار کر بیٹھے ہیں۔ اور
کسی کو واجب الاطاعت ماننے کے لئے تیار نہیں تو میں نے ایک لمحہ توقف کئے بغیر
فیصلہ کر لیا کہ جماعت جس کو بھی خلیفہ قبول کرے گی میں بھی اس کی بیعت کر لوں گا۔
چنانچہ جب حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضؓ کی آخری تیاری کے بعد مگر جنازہ پڑھنے
سے قبل مسجد نور میں اس غرض کے لئے اجتماع ہوا کہ خلیفہ کا انتخاب کیا جائے
اور مولوی محمد علی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی انتہائی مخالفانہ کوششیں
کے باوجود بہت بڑا اجتماع ہوا اور اس میں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
صاحب کو خلیفہ منتخب کیا گیا تو میں نے بھی بیعت کر لی۔ الحمد للہ علی
ذالک ۔

خلافت ثانیہ کے قیام کے ساتھ ہی جہاں مولوی محمد علی صاحب اور
ان کے ساتھیوں کی مخالفانہ کوششیں بہت تیز ہوگئیں۔ وہاں خلافت کی
بیعت میں شامل ہونے والوں کی سرگرمیاں اور مدافعت میں روز بروز بہت ہی
غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ اور ہر چھوٹا بڑا افراد جماعت مستعدین کی طرح کام کرتا ہوا
نظر آیا۔ میں اگرچہ کسی قابل نہ تھا۔ تاہم میرے دل میں بھی بڑی خواہش پیدا
ہوئی کہ کاش میں بھی کچھ کر سکوں۔ خدا تعالیٰ کو میری یہ خواہش کچھ ایسی پسند
آئی کہ بہت ہی جلد اس کے پورا کرنے کی صورت پیدا کر دی۔ چنانچہ ابھی
مارچ کا مہینہ ختم نہ ہوا تھا کہ ایک دن جناب قاضی اکمل صاحب نے مجھے فرمایا
کہ اگر تم "الفضل" کے دفتر میں کام کرنا چاہو تو میں اس کا انتظام کر دوں۔
میں فوراً تیار ہو گیا اور جناب قاضی صاحب مجھے ساتھ لے کر دفتر الفضل میں

چھوڑ آئے اور اخبار کی پیٹیں بنانے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ میں یہ کام پہلے
تشحیذ الاذہان اور ریویو میں بھی کر چکا تھا اس لئے میرے لئے نیا اور مشکل نہ
تھا۔ میں نے عمدگی سے کام کرنا شروع کر دیا اور میرا کافی وقت بچ جاتا تھا۔
چند ہی روز بعد ایک دن جناب قاضی صاحب نے کہا کہ حضرت
امیر المومنین نے فرمایا ہے کہ میں جو درس قرآن کریم روزانہ مسجد اقصیٰ میں دیتا ہوں
وہ مرتب کر کے اخبار میں شائع کرنے کے لئے مجھے دیدیا کرو۔ مکرم قاضی صاحب
کی یہ تجویز سن کر میں حیرت زدہ ہو گیا کیونکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ
آ سکتا تھا کہ حضرت امیر المومنین کی تقریر اور وہ بھی قرآن کریم کے معارف
پر تقریر کا کچھ حصہ بھی میں اس رنگ میں لکھ سکوں گا جو اخبار میں شائع ہو سکے۔
جناب قاضی صاحب نے مجھے ہمت دلائی۔ وہ خود سلسلہ کے بہترین زود
نویس اور بہترین تقاریر قلمبند کرنے والے تھے، اور سالہا سال سے یہ
کام اخبار "بدر" میں کر چکے تھے۔ اخبار الفضل میں انہی کے قلمبند کردہ
خطبات جمعہ فرمودہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رض کے درس کے نوٹ بھی
شائع ہو چکے تھے۔ یعنی یہ نوٹ سورۃ فاتحہ سے لے کر سورۃ والناس تک کے
انہوں نے قلمبند کر کے بطور ضمیمہ شائع کئے تھے۔ لیکن اول تو حضرت خلیفۃ
المسیح الاول رض کا طرز بیان قلّ و دلّ کا رنگ رکھتا تھا۔ دوسرے نوٹ
قلمبند کرتے وقت اور مختصر ہو گئے تھے۔ تیسرے حضرت خلیفۃ المسیح الاول رض
آہستہ تقریر فرماتے تھے۔ چوتھے نوٹ لکھنے والے کو جہاں مشکل پیش
آتی وہاں خموشی اختیار کر لی جاتی۔ ان امور کے پیش نظر حضور کے درس

القرآن کے نوٹ مرتب کرنا نسبتاً آسان تھا لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی
بڑی روانی سے بہت تیز تقریر فرماتے۔ نیز آپ نے درس اس مقام سے شروع
فرمایا جہاں حضرت خلیفۃ المسیح اول بوجہ بیماری کی انتہا کو پہنچ جانے کی وجہ
سے درس دینے سے معذور ہو گئے تھے، اور وہ ستائیسویں پارے کا آخر
تھا اور آخری سورتیں نسبتاً مشکل ہیں۔

اس وجہ سے حضور کے درس کے نوٹ مرتب کرنا اپنے لئے ناممکن
سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں میری اہلیت بھی بہت محدود تھی۔ قرآن کریم
کے صرف معنی پر بھی مجھے پورا عبور نہ تھا، اس لئے میں بہت گھبرا گیا۔ مگر
جناب قاضی صاحب نے مجھے آمادہ کر ہی لیا۔ اور میں یہ خیال کر کے کہ
جو بات میری سمجھ میں نہ آئے گی اور جسے میں محفوظ نہ کر سکوں گا تو خاموشی اختیار
کر لوں گا، تیار ہو گیا اور کاپی پنسل لے کر درس میں جا بیٹھا۔

مجھے یاد ہے کہ پہلے دن جو کچھ میں نے لکھا کچھ بھی میری سمجھ میں نہ
آیا۔ لیکن درس ختم ہونے کے معاً بعد میں نے اسے مرتب کرنے کی کوشش کی
اور جو کچھ لکھا صبح سویرے ہی لے کر جناب قاضی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔
قاضی صاحب نے اس کی تصحیح فرمائی اور میں نے پھر اسے صاف کر کے لکھا۔
چونکہ خلافت ثانیہ کے ابتدائی ایام تھے، اور روزانہ اکثر لوگ حضور کی
زیارت اور بیعت کے لئے آتے تھے۔ حالات سناتے تھے۔ نیز بذریعہ
ڈاک بھی اہم اور ضروری کوائف کثرت سے پہنچتے تھے اس لئے حضور روزانہ صبح
کو کھلی مجلس میں تشریف رکھتے، گفتگو فرماتے، ڈاک کا مطالعہ کرتے اور

ضروری ہدایت ارشاد فرماتے۔ میں بھی چھوٹی سی کاپی پر چند سطریں لکھ کر لے گیا اور موقع پا کر حضور کی خدمت میں وہ سطور ڈرتے ڈرتے پیش کر دیں۔ چونکہ مجھے خیال تھا کہ قریباً ایک گھنٹہ کا درس جو بڑے تیز دھارے کی طرح ٹھاٹھیں مارتا رہتا تھا، چند سطروں اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پیش کرنا درس کا منہ چڑانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور حضور یہ دیکھتے ہی اسے ناپسند فرمائیں گے۔ لیکن میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی کہ جب میں نے دیکھا کہ حضور نے قلم لے کر اصلاح فرمانی شروع کر دی۔ بعد اصلاح مجھے کاپی عنایت کرتے ہوئے فرمایا۔ قاضی صاحب کو چھپانے کے لیے دے دو۔ چنانچہ میں لے گیا اور دکھا کر کہ حضور نے خود اس کی تصحیح فرمائی ہے۔ قاضی صاحب بہت خوش ہوئے اور "الفضل" میں درج کرا دیا

یہ میری پہلی تحریر تھی جو الفضل میں شائع ہوئی اور اس سے میری ہمت حوصلہ اور جرأت بڑھ گئی۔ پھر کیا تھا نہایت شوق سے جو کچھ لکھ سکتا تھا راتوں رات مرتب کرتا۔ قاضی صاحب سے درست کراتا، حضور کی خدمت میں پیش کرتا اور حضور اصلاح فرماتے۔ اسی طرح چند روز ہی گزرے تھے اور میں لکھے ہوئے درس القرآن کے نوٹ جیب میں تھے کہ ایک دن نوٹوں والی کاپی ملاحظہ کرنے کے بعد مجھے ہدایت دیتے ہوئے حضور نے مجھے فرمایا:۔

"آئندہ نوٹ نہیں بلکہ مفصل درس لکھا کرو۔"

یہ سن کر مجھ پر خوف طاری ہوا کہ مفصل نوٹ لکھنے کیونکر ممکن ہو سکیں گے۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری کیونکہ اس ہدایت سے مجھے بہت کچھ ہمت حاصل ہو چکی تھی

کہ حضور خود میرے لکھے ہوئے نوٹوں کی تصحیح فرماتے ہیں اور وہ اخبار میں شائع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حضور کا درس القرآن میں نے مفصل لکھنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ جن آیات کے حضور صرف معنی بیان فرماتے تفسیر و تشریح نہ کرتے ان کے بھی معنی نوٹ کر لیتا۔

پہلے دن جب میں نے اس طرح درس لکھ کر پیش کیا تو حضور نے اس کی بھی تصحیح فرما دی اور مجھے کسی قدر اطمینان حاصل ہوا کہ میں اس کام کو کر سکوں گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اٹھائیسویں پارہ کی تشریح سے میں نے مفصل درس لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ ۲۸-۲۹ اور ۳۰ تینوں پاروں کا مفصل درس میرا لکھا ہوا "الفضل" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد پھر حضور شروع سے درس دینے لگے اور میں اسے قلمبند کرتا گیا۔ پہلے پارے کا کچھ حصہ شائع بھی ہوا۔ اس وقت مجھے لکھنے کی اچھی مشق ہو چکی تھی اور پوری تفصیل سے لکھ لیتا۔ لیکن کثرت اشغال کی وجہ سے حضور نظر ثانی نہ فرما سکتے اور اس وجہ سے درس کی اشاعت بند ہو گئی۔ تاہم میں برابر لکھتا گیا جو بہت سی مجلدوں میں محفوظ تھا۔ آخر حضرت مولوی شیر علی صاحب نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمے کے سلسلہ میں مجھ سے لے لیں۔

بعض اوقات میں نے درس القرآن کے متعلق احباب کی دلچسپی کو دیکھ کر یہ بھی جرأت کی کہ میں درس القرآن کے مختصر نوٹ صرف اپنی ذمہ داری پر شائع کرنا شروع کر دیتا اور مختلف اوقات میں میں نے اس طرح بعض حصے الفضل میں شائع کئے اور سورۂ نور کے مکمل اور مفصل نوٹ "حقائق القرآن"

کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیے اور خدا تعالےٰ کے فضل سے کسی قابلِ گرفت غلطی سے محفوظ رہا۔ لیکن عام طور پر تفسیر القرآن کے اس نہایت نازک کام سے جو حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب ہوتا تھا بچنے کی کوشش کرتا رہا ؛

ابتداء میں جب میں نے درس القرآن لکھنا شروع کیا اور حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصحیح فرمائی اور وہ اخبار میں شائع ہوگیا، اس کے اصل تمام مسودے میں نے بڑی احتیاط سے جلد کرا کر رکھے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ ابتداء میں کس قدر ترتیب کیا اور پھر کس طرح روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ لیکن افسوس یہ مقدس اور قیمتی قلمی تحریروں کا مجموعہ بھی قادیان سے محروم ہونے کے دوران ضائع ہوگیا! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؛

زُود نویسی

اردو زود نویسی نے اس وقت تک ایک فن کی صورت اختیار نہ کی تھی کوئی طریق اور قاعدہ مقرر نہ تھا جو کسی استاد سے سیکھ لیا جاتا۔ بلکہ کلیۃً ہاتھ کی پھرتی اور دماغ کی مضبوطی پر انحصار تھا جو اتنے سیدھے الفاظ ہاتھ کاغذ پر بکھیر سکتا یا سلسلہ تقریر کو دماغ محفوظ رکھ سکتا۔ اسکی بناء پر تقریر قلم بند کی جاتی۔

خلافتِ ثانیہ کی ابتداء میں ہی جبکہ میں نے درس القرآن لکھنا

شروع کیا میرے سپرد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کا خطبہ جمعہ لکھنے کی خدمت بھی کی گئی اور میں درس کی نسبت جمعہ کا خطبہ نہایت آسانی سے لکھنے لگا اور جوں جوں مشق ہوتی گئی اور ضرورت ایجاد کی ماں بن کر نئی نئی آسانیاں سمجھاتی گئی میں عمدگی سے تقریر لکھنے لگا۔ حتیٰ کہ پہلے سال جب دسمبر کے آخر میں جلسہ سالانہ ہوا تو اس موقعہ کی حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی کئی تقریریں جن میں بعض کافی لمبی تھیں وہ بھی میں نے ہی مرتب کیں۔

زود نویسی کے سلسلہ میں میں نے اپنے لئے وقتاً فوقتاً جو آسانیاں ایجاد کیں وہ یہ تھیں :-

۱- لکھنے کا کاغذ چکنا ہو۔

۲- پنسل نرم ہو، سکہ کافی لمبا گھڑا جائے، پوری موٹائی میں لکھنے دیا جائے، سرا بھی گول رکھا جائے۔

۳- الفاظ کے گھیرے مکمل نہ بنائے جائیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے انکو مختصر رکھا جائے۔

۴- نقطے بالکل نہ ڈالے جائیں۔

۵- فقروں میں سے چھوٹے موٹے الفاظ جہانتک ہو سکے حذف کرنے کی عادت ڈالی جائے، یعنی میں - سے - کو - ہے - ہیں وغیرہ الفاظ نہ لکھے جائیں اور نامکمل فقرات لکھے جائیں۔

۶- مقرر کے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کیجائے - اگر کچھ پیچھے رہ جائے تو اس حصہ تقریر کو چھوڑ کر مقرر کے ساتھ مل جانا چاہیئے۔

۷۔ قرآن کریم کی آیات اور حدیث کا صرف ایک آدھ لفظ لکھ لیا جائے اور مرتّب کرتے وقت اس لفظ کے ذریعہ آیت یا حدیث کا پتہ لگا کر لکھا جائے۔

۸۔ جلد سے جلد تر تقریر کی نظر ثانی کی جائے، اور جو الفاظ دماغ میں محفوظ ہوں انکو بھی کاپی پر نوٹ کر لیا جائے۔ جلد سے جلد تقریر کو مرتّب کرنے کی کوشش کیجائے۔

۹۔ کاپی کے ایک طرف نوٹ کیا جائے تا کہ ورق الٹنے میں آسانی اور جلدی ہو سکے۔

۱۰۔ مرتّب کرتے وقت کاپی کے الفاظ قائم رکھ کر مکمل کیے جائیں۔

جوں جوں تجربہ بڑھتا گیا یہ تجویزیں سوجھتی گئیں، اور میں نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا اور خدا تعالیٰ کے فضل سے حضور کی لمبی سے لمبی تقریر جو بعض اوقات ۳-۴-۵-۶ گھنٹے تک بھی نہائت روانی کے ساتھ ہوتی، نہائت عمدگی سے لکھ لیتا، اور حضور نے بار بار انتہائی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اور تعریف میں یہاں تک فرمایا کہ بعض اوقات نظر ثانی کرتے ہوئے مجھے یاد نہیں ہوتا کہ فلاں فلاں بات میں نے کہی ہے یا نہیں لیکن وہ ہوتی درست ہے اور ٹھیک موقعہ اور محل پر درج ہوتی ہے۔

حضرت حافظ روشن علی صاحب رضی اللہ عنہ

حضور کی تقریر قلم بند کرنے کے سلسلہ میں مجھے اس قدر مشق ہو گئی کہ کوئی اور تقریر قلم بند کرنا میرے لئے بہت آسان تھا کیونکہ ساری جماعت میں خدا تعالیٰ کے فضل سے جو بڑے بڑے اعلیٰ مقرر تھے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی تقریر میں حضور سے زیادہ روانی اور تیزی ہو اور اس وجہ سے میں ہر مقرر کی تقریر بآسانی قلم بند کر سکتا۔

ایک دفعہ میں نے جلسہ سالانہ کے موقعہ پر حضرت حافظ روشن علی صاحب رضی اللہ عنہ کی تقریر لکھی جو وفات مسیح پر تھی۔ یہ تقریر جب میں نے نظر ثانی کے لئے حضرت حافظ صاحب رضی اللہ عنہ کو سنائی تو آپ حیران رہ گئے۔ بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا اور مجھ پر ایک نوازش سے پہلے پڑھ گئیں۔ آپ نے ساری تقریر میں جو نہایت مفصل تھی اور جسے میں نے رسالہ کی صورت میں شائع کیا ایک لفظ کی بھی اصلاح نہ فرمائی اور ساری تقریر سن کر فرمایا۔ یہ تقریر تو میری ہی ہے، مگر مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے اتنی مفصل اور ایسے تسلسل سے یہ تقریر کی تھی۔ اب یہ تقریر سن کر مجھے بھی لطف آ گیا ہے۔ اس موقعہ پر بہت دعائیں بھی دیں جو خدا تعالیٰ نے میرے حق میں منظور فرمائیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

حضرت حافظ صاحب بھی ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے

مجھ پر ابتدائی اور بعد میں زندگی میں بڑے احسانات کئے، بڑی محبت اور شفقت کا سلوک کیا اور قرآن کریم پڑھانے کا اہتمام کیا۔

ابتدائی ایام میں جبکہ میں طالب علم تھا مگر تعلیم کا باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ ایک دن میں بہشتی مقبرہ کو جا رہا تھا کہ حضرت حافظ صاحب اپنے ایک دو شاگردوں کے ہمراہ بہشتی مقبرہ سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ پل کے پاس مجھے ملے اور بڑے پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے، تم ہمارے ہم وطن ہو اور یہاں ہمارے ہمسائے ہو۔ جی چاہتا ہے کہ تم کام کے آدمی بن جاؤ۔ محنت سے تعلیم حاصل کرو اور شوق سے دین کا علم سیکھو تا کہ جس طرح تمہارا چہرہ روشن ہے تمہارا سینہ بھی روشن ہو جائے۔

جب تک آپ زندہ رہے میں نے آپکی شفقت اور نوازش سے بے حد فائدہ اٹھایا۔ کچھ عرصہ باقاعدہ صبح کی نماز کے بعد آپ میری جائے رہائش میں تشریف لا کر مجھے قرآن شریف پڑھاتے رہے۔ یہ سلسلہ میری سستی اور کوتاہی سے بند ہوا، حالانکہ اور بھی بہت سے دوست اس وقت جمع ہو کر مستفید ہوتے تھے۔ اخبار نویسی کے دوران میں ہر رنگ کی علمی امداد آپ سے میسر آتی۔ اخبار باقاعدہ شاگردوں سے پڑھوا کر سنتے اور اکثر اوقات خوشی کا اظہار فرماتے اور داد دے کر حوصلہ افزائی فرماتے۔ غرض میرے لئے سر تا پا رحمت اور شفقت تھے۔

مُبلّغین کلاس

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے ابتدا میں ہی حضرت میر محمد اسحٰق صاحب رضی اللہ عنہ نے جن کی علمیت، جن کے اخلاق، جن کی شفقت اور حسنِ سلوک، جن کا پیار اور محبت، جن کی مومنانہ بے تکلفی، جن کی پُر لطف کشش انگیز اور پُر مذاق گفتگو، جن کی سادگی اور خندہ پیشانی اور جن کی سرگرمی اور دُھن جن کی غیر معمولی محنت اور مشقت۔ غرض جن کی ہر خوبی خاص شان رکھتی تھی انہوں نے سلسلہ کے اہم اور ضروری کاموں میں منہمک رہتے اور مدرسہ احمدیہ میں باقاعدہ تعلیم دینے کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ بطور خود ایک مبلغین کلاس جاری فرمائی تھی جس میں ابتداء میں تو چند نوجوان شامل ہوئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں بعض معمر اصحاب بھی شریک ہونے لگے اور طالب علموں کی تعداد کافی ہوگئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی اور حضرت میر صاحب رضی اللہ عنہ کا حسنِ اخلاق کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں ہی مجھے ان سے نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ میں بعض اوقات آپ سے اپنے مضامین کی اصلاح بھی کرا لیا کرتا۔

اُس وقت میری رہائش حضرت نواب صاحب والے قصبہ کے مکان کی نچلی منزل میں تھی۔ اوپر کے ایک حصہ میں حضرت حافظ روشن علی صاحب رضی اللہ عنہ اور دوسرے حصے میں حضرت میر صاحب رضی اللہ عنہ

رہائش رکھتے تھے۔ مجھے قادیان کی رہائش میں جو پہلا رمضان آیا اس میں سحری کے کھانے کے متعلق کافی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ کھانے کا عام حالات میں کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا لیکن جو کچھ بھی تھا وہ رمضان میں بالکل درہم برہم ہوگیا۔ روزہ رکھنے کی مجھے بچپن سے ہی عادت تھی۔ میں سحری کو اٹھتا اور روزہ باقاعدہ رکھتا۔ خواہ کچھ کھانے کے بغیر ہی رکھنا پڑے۔ ان ایام میں حضرت میر صاحب رضؓ نے کئی بار میرے لئے بڑی آسانی مہیا فرمائی۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

چونکہ میں حضرت میر صاحب سے کچھ نہ کچھ متعارف تھا اس لئے آپ نے مجھے بوائز کلاس میں شامل فرمالیا۔ اور ہم چند لڑکے اور بعض معمر آدمی آپ سے قرآن کریم اور حدیث پڑھنے لگے۔ جمعہ کے دن صبح کی نماز کے بعد مسجد میں کسی طالب علم سے تقریر بھی کراتے تاکہ لیکچر دینے کا ملکہ پیدا ہو۔ مختلف مسائل کے متعلق نوٹ لکھاتے اور یہ سلسلہ بڑے اہتمام سے اس وقت تک جاری رکھا کہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے اس کلاس کو مبلغین کی باقاعدہ جماعت بنانے کا ارشاد فرمایا۔ جو نوجوان سارا وقت پڑھنے میں لگا سکتے تھے ان کو داخل کیا گیا۔ بورڈنگ خوراک اور رہائش کے لئے تجویز ہوا۔ اور اس کلاس کو مدرسہ احمدیہ کی باقاعدہ کلاس بنا دیا گیا جہاں مختلف اساتذہ تعلیم دیتے تھے۔

حضرت مولوی سید سرور شاہ صاحب قرآن کریم پڑھاتے۔
حضرت قاضی امیر حسین صاحب مشکوٰۃ کی تعلیم دیتے۔ حضرت میر صاحب

مختلف مسائل پر نوٹ لکھاتے حضرت میر قاسم علی صاحب ایڈیٹر "فاروق" عیسائیت اور آریہ دھرم کے متعلق تعلیم دیتے۔ سب لڑکوں کو انجمن ترقی اسلام سے وظیفہ دیا جاتا۔ میں اس وقت دفتر "الفضل" میں کام کرتا تھا۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی باقاعدہ مبلغین کلاس میں داخل ہو کر پڑھنے کا ارشاد فرمایا۔ الفضل کے کام سے فارغ کرا دیا۔ سوائے اس کے کہ خطبہ جمعہ لکھتا رہوں اور الفضل سے میری تنخواہ جاری رکھی۔ اس وقت تک حضور الفضل کے تمام اخراجات خود ادا فرماتے تھے۔

"الفضل" کے ادارہ میں شمولیت

قبل اس کے کہ میں اس تسلسل کو آگے بڑھاؤں، ایک خاص واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ واقعہ آن کی آن میں گزر گیا لیکن وہ گھڑی اور وہ آن ایسی مبارک تھی کہ میری زندگی کی بنیاد اس وقت رکھی گئی۔ اور محض خدا تعالیٰ کے فضل سے ایسی مضبوط اور پائیدار رکھی گئی کہ جس پر نہایت شاندار عمارت تعمیر ہوئی، ایسی شاندار کہ تاریخ احمدیت میں اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم ایک لمبے عرصہ تک وہ اپنی مثال آپ ہی ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن حضرت میر صاحب حسب معمول مسجد اقصیٰ کے اس جنوبی حصہ میں بیٹھے جہاں خواتین جمعہ کی نماز ادا کیا۔

کرتی تھیں۔ (اس وقت مسجد اتنی وسیع نہ تھی جتنی بعد میں کی گئی۔تاہم قدیمی عمارت سے جنوب کی طرف کچھ اضافہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کیا گیا تھا اور اسی اضافہ کا جنوبی حصہ لکڑی کے پردے سے عورتوں کے لئے نماز جمعہ پڑھنے کی جگہ بنائی گئی تھی) پڑھا رہے تھے۔گرمی کا موسم تھا، ظہر کی نماز پڑھ کر ہم پڑھنے بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے آکر آپ کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیا۔آپ نے لیکر پڑھا۔میں آپ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔آپ نے میری طرف رقعہ بڑھایا اور بڑی شفقت سے مسکراتے ہوئے ایک لفظ پر انگلی رکھ کر فرمایا، یہ پڑھو!

درس القرآن کے مسودہ کی اصلاح کرانے کے سلسلہ میں میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ کا خط دیکھتا اور پہچانتا تھا۔رقعہ دیکھتے ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ حضور کا لکھا ہوا ہے۔اور جب میں نے وہ لفظ پڑھا جس پر حضرت میر صاحب نے انگلی رکھی تھی تو میری خوشی اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ لفظ یہ تھا:-

عزیزم غلام نبی

اُس وقت جی تو چاہتا تھا کہ ایک ایک کو یہ لفظ دکھاؤں اور خوشی کا اظہار کروں مگر میں نے ضبط سے کام لیا اور صرف مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

اس کے بعد جوں جوں میں پڑھتا گیا خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں گم ہوتا گیا۔سارا رقعہ پڑھ کر میں نے اپنے پاس رکھ لیا اور بغیر ایک لفظ کہے درس میں شریک ہوگیا۔

ہاتھ یہ نہایت قیمتی تحریر جو میں نے سالہا سال تک بڑی احتیاط سے محفوظ رکھی اور جسے دیکھ کر اس وقت کا ہو بہو نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا تھا اور جس کے متعلق میرا ارادہ تھا کہ آخری دم تک میں اسے محفوظ رکھوں گا، قادیان کو چھوڑتے وقت وہ بھی چھوٹ گئی۔

بال بچوں کو جب میں نے قادیان سے قافلہ کے ساتھ بھیجا تو اس وقت بہت سی قابل یادگار تحریریں ان کے ساتھ بھیج دیں، لیکن جو نہایت ہی اہم تحریریں تھیں وہ نہ بھیجیں کہ معلوم نہیں بچوں اور عورتوں کو کہاں سر چھپانے کی جگہ ملے اور ان تحریروں کا کیا انجام ہو۔ اور زیادہ اہم تحریریں اپنے پاس رکھ لیں اور ارادہ یہ تھا کہ انکو اپنی جان کے ساتھ رکھوں گا، اور آخر دم تک ضائع نہ ہونے دوں گا لیکن خدا تعالیٰ کو جو منظور تھا وہی ہوگا۔ جو تحریریں پہلے بھیجدی تھیں وہ تو محفوظ رہیں لیکن جن کے لئے زیادہ احتیاط کی گئی تھیں وہ ضائع ہو گئیں۔

غرض اس طرح وہ قیمتی اور بیش بہا تحریر بھی ضائع ہو گئی لیکن چونکہ میں نے اسے بار ہا پڑھا اور پڑھتا رہتا تھا اس لئے اس کے بہت سے مطالب مجھے اب بھی یاد ہیں اور میں حافظہ کی بناء پر انہیں درج ذیل کرتا ہوں۔

حضور نے تحریر فرمایا تھا:۔

عزیزم غلام نبی۔ السلام علیکم

چونکہ خدا تعالیٰ نے میرے سپرد بہت بڑا کام کیا ہے اور اب الفضل کو ایڈیٹ کرنے کے لئے وقت نہیں نکال سکتا اس لئے چاہتا ہوں کہ

کچھ نوجوانوں کو اس کام کے لئے تیار کروں اور ان کے سپرد یہ کام کردوں جو میں خود کیا کرتا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کسی اور کو منتخب کروں تم کو اور ضیاء احمد کو موقع دیتا ہوں۔ اگر تم اپنے آپ کو اس قابل بنا سکو اور اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر سکو تو اس کے لئے حسب ذیل باتیں ضروری ہیں :-

۱۔ کم از کم قرآن مجید کا ترجمہ آنا چاہیئے اور صحاح ستہ پر عبور ہونا چاہیئے۔

۲۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتب پر عبور ہونا چاہیئے۔

۳۔ غیر مذاہب کی مذہبی کتب کی واقفیت ہونی چاہیئے۔

۴۔ خلیفۂ وقت کی اطاعت اور اس سے وابستگی لازمی چیز ہے۔

۵۔ حکومت وقت کی اطاعت ضروری ہے۔

۶۔ احمدیت کے لئے اخلاص اور ہر قسم کی قربانی کرنے کا جذبہ ہونا چاہیئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم میں اس کے متعلق بہت کمی ہے۔ اگر تم کچھ سیکھو محنت اور کوشش کر سکو تو میں تم کو موقع دینا چاہتا ہوں۔ تم سوچ کر مجھے اس کے متعلق جواب دو۔"

الفاظ میں کچھ کمی بیشی ضرور ہوئی مگر مفہوم یقیناً یہی تھا۔

میں نے حضور کے ارشاد پر اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق غور کیا لیکن کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ ایک طرف اپنی حالت کو دیکھتا اور دوسری طرف جب اس عظیم الشان کام کی طرف نظر کرتا جسے کرنے کی قابلیت پیدا

کرنے کے لئے مجھے کہا گیا تھا، اور جیسے وہ انسان سرانجام دے چکا تھا جسے خدا تعالیٰ نے خلافت کے درجہ پر متمکن فرمایا تو میرا دل بیٹھنے لگتا۔ آخر میں نے بڑی کشمکش کے بعد چند الفاظ لکھنے کی کوشش کی اور وہ یہ تھے:۔

"سیدی و آقائی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حضرت میر محمد اسحاق صاحب کی وساطت سے حضور کا رقعہ مجھے ملا ہے اس کے متعلق نہایت ہی مؤدبانہ عرض ہے کہ میں تو اپنے آپ میں کوئی ایسی بات نہیں پاتا کہ اس قابل بن سکوں گا۔ لیکن یہ یقین رکھتا ہوں کہ حضور اگر ایک تنکے سے بھی کام لینا چاہیں تو خدا تعالیٰ اس میں اس کام کی اہلیت پیدا کر دے گا۔ میں ایک تنکے کی حیثیت سے یہ کہتے ہوئے اپنے آپ کو حضور کے قدموں میں پیش کرتا ہوں ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

طالب دعا غلام نبی"

اس واقعہ کے بعد کچھ عرصہ حضرت میر صاحب ہی ہمیں پڑھاتے رہے۔ پھر مبلغین کی باقاعدہ جماعت بن گئی۔ مجھے اس میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد "الفضل" میں بلا لیا گیا۔ اور میں روز بروز یہ محسوس کرنے لگا کہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ مجھ پر خاص شفقت اور ذرہ نوازی کی نظر فرماتے جا رہے ہیں۔ درس القرآن اور خطبہ جمعہ کے علاوہ میں مضمون نویسی کی بھی مشق کرتا رہتا۔ اب اس پر زیادہ زور دینا شروع کیا۔

جب کوئی چھوٹا موٹا مضمون لکھ لیتا تو موقعہ پاکر حضور کی خدمت میں برائے اصلاح پیش کر دیتا اور حضور بڑی نوازش سے اسے درست فرما دیتے۔

ان دنوں حضور تحریر کا کام فرش پر بیٹھ کر مسجد کے قریب اس کمرہ میں کیا کرتے تھے جو گول کمرے کے نام سے موسوم تھا۔ حضور نے مجھے وہاں طلب فرما لیتے کہ اس مضمون کو مفصل طور پر مرتب کر کے لاؤ۔ میں نوٹ پنسل سے جلدی جلدی لکھ لیتا اور پھر دفتر میں آکر انکی بناء پر مضمون مرتب کرتا اور اگلے دن حضور کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ حضور اس کی اصلاح فرماتے۔ نیز غلط الفاظ کی بجائے صحیح الفاظ سکھاتے۔ ان الفاظ میں سے ایک دو مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ مثلاً حضور نے فرمایا:۔

"ناکامیابی غلط ہے، ناکامی لکھنا چاہیئے۔ مشکور غلط ہے اس کی بجائے شاکر یا ممنون لکھنا چاہیئے۔"

جیسا کہ میں اوپر کسی جگہ ذکر کر آیا ہوں کہ ابتداء میں جب مجھے اخبار "زمیندار" اور "الہلال" پڑھنے کا موقع ملا تو میں اپنی بساط کے مطابق یہ کوشش کرتا کہ ان کے ڈھنگ کے الفاظ اور تراکیب خود بھی استعمال کروں۔ چنانچہ میں ان کے فقرے کے فقرے یاد کر لیتا اور پھر انکو اپنی تحریر میں لانے کی کوشش کرتا۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ جب التزام کے ساتھ میرے مضامین کی اصلاح فرمانے لگے، تو ایک دن حضور نے مجھے نصیحت فرمائی کہ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب استعمال کرنے سے تم کو سلیس اردو لکھنا نہیں آئیگی

اور تم سادگی اور بے تکلفی سے مافی الضمیر ادا کرنے کے قابل نہیں بن سکو گے، اس لئے اس طرز کو چھوڑ دو۔ جب تمہیں اردو لکھنا آجائے تو اس قسم کی باتیں خود بخود آجاتی ہیں۔

اس پر اس طرز کو بدلنے اور سادگی اور سلاست سے لکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن پہلی عادت کے مطابق کوئی لفظ یا ترکیب ذرا قلم سے نکل جاتا تو قطع نظر اس کے کہ وہ برمحل یا بے محل اور درست ہوتا یا غلط، حضور میرے مضمون پر نظر ثانی فرماتے ہوئے اسے قلم زد فرما دیتے۔ اس طرح مجھے سادگی اور بے تکلفی سے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی تربیت دی گئی اور کچھ عرصہ بعد ایک دن جبکہ حضور بعد نماز عصر مسجد مبارک میں خدام کے حلقہ میں رونق افروز ہوئے تھے کسی ذکر پر فرمایا:-

"غلام نبی کو تکلف سے لکھنے اور ثقیل الفاظ اور تراکیب استعمال کرنے کا بڑا شوق تھا لیکن میں نے اس کے اس شوق کو اس قدر دبایا کہ اب اس کی تحریر بہت سادہ ہو گئی ہے۔"

اللہ اللہ! کیا ہی مبارک دن تھے کہ حضور اپنے ایک ادنیٰ ترین خادم کا ذکر کس محبت و شفقت سے فرماتے ہیں!

اگرچہ حضور کے لکھائے ہوئے نوٹوں کی بنا پر مضمون مرتب کرنے کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ اور جاری رہ بھی کس طرح سکتا تھا جبکہ حضور کی مصروفیات حد و حساب سے باہر تھیں۔ تاہم

حضور وقتاً فوقتاً اس شفقت سے نوازتے رہے اور اس طرح مجھے مضمون نویسی کی وہ تربیت حاصل ہوئی جس کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے محض فضل سے اس میں منفرد تھا کیونکہ میرے سوا کسی اور کو اتنا موقعہ میسر نہ آیا اور نہ اتنا لمبا عرصہ کسی نے نقش اٹھایا جتنا عرصہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس سے کام لینے کی توفیق بخشی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔ یعنی تہائی صدی سے بھی زیادہ الفضل کی ایڈیٹری کی۔

یہ سطور لکھنے کے چند ہی روز قبل مجھے مولانا عبدالمجید صاحب سالک ایڈیٹر "انقلاب" کی خود نوشتہ "سرگذشت" کی چوتھی قسط اخبار "امروز" ۱۵ار جنوری ۱۹۵۱ء میں پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں وہ اپنے متعلق لکھتے ہیں :-

"مولوی سید ممتاز علی صاحب کی ہدایت اور رہنمائی سے میں نے بچوں اور عورتوں کے لئے سادگی اور سلاست کے ساتھ مضامین لکھنا سیکھا، اور میرا عقیدہ ہے کہ جبتک کوئی شخص اپنے مافی الضمیر کو سادگی، بے تکلفی اور سلاست سے ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اچھا انشاپرداز نہیں بن سکتا۔"

الفضل میں کام سیکھنے والے دوسرے دوست

حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کا وہ رقعہ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اگرچہ میرے ہی نام تھا لیکن اس میں ایک صاحب نیاز احمد

کا بھی ذکر تھا اور میں نے انکو بھی پڑھا دیا تھا۔ انہوں نے حضور کو کوئی جواب دیا یا نہیں، یہ مجھے معلوم نہ ہوا۔ وہ مکرم قاضی اکمل صاحب کے رشتہ دار تھے اور الفضل کے اجراء کے وقت ہی انکو چھوٹے موٹے کام پر لگایا گیا تھا۔ اخبار کی کاپیاں پڑھتے اور مضمون نویسی کی مشق کرتے اور مدرسہ احمدیہ میں کچھ تعلیم بھی پاتے۔ لیکن چند سال کے بعد الفضل کو چھوڑ کر چلے گئے۔

میرے ہم عمر مالیر کوٹلہ کے ایک شخص مہر محمد خان شہاب کو بھی ابتدا میں ہی کام سیکھنے کے لئے لگایا گیا، پھر انکو مبلغین کلاس میں داخل کرا دیا گیا۔ جب مبلغین کلاس ختم ہو گئی تو کچھ عرصہ مبلغ کے طور پر کام کرتے رہے، اور جب الفضل کا کام میرے سپرد ہوا تو میں نے کوشش کر کے ان کو نائب کے طور پر الفضل میں لے لیا۔ انہوں نے کافی عرصہ میرے ساتھ کام کیا لیکن بدقسمتی سے بہائیت کے جال میں پھنس گئے اور خفیہ طور پر بہائیت کے ہتھکنڈوں سے کام لینے لگے۔ جب اس کی اطلاع حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کو پہنچی تو حضور نے تحقیقات کرائی جو درست ثابت ہوئی۔ اس پر حضور نے مہر محمد کو اور اس کے دو تین ساتھیوں کو جن کا سرغنہ ایک دیو بندی مولوی محفوظ الحق تھا جو دراصل بہائی تھا لیکن چند سال سے جماعت میں بہائیت کا فتنہ پھیلانے کے لئے داخل ہو چکا تھا۔ جماعت سے خارج کر دیا۔ اور اس طرح راز فاش ہو جانے پر وہ خود بخود قادیان سے چلے

گئے تھے ـــــــــ اس موقعہ پر اس امر کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اور خاندانِ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وسیع القلبی کا ایک ادنیٰ ثبوت کہ مہر محمد خان نے اپنی تنگدستی کی وجہ بیان کر کے ایک کنال کا قطعہ زمین عام قیمت اڑھائی سو روپے کی بجائے صرف ایک سو رعایتی قیمت پر حاصل کیا ہوا تھا۔ لیکن جب غداری اور ارتداد کے جرم کا مرتکب ہو کر جانے لگا تو حضرت مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ نے جن کے سپرد اراضیات کی خرید و فروخت کا انتظام تھا اسے اڑھائی سو روپے ادا کئے۔ اور میرے ذکر کرنے پر فرمایا کہ جو ہم احسان کر چکے ہیں وہ واپس نہیں لینا چاہتے۔

میرے علاوہ چند اور نوجوانوں کو بھی حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ نے تفضل میں کام سیکھنے کے لئے لگایا تھا جن کے نام یہ تھے :-

۱۔ مولوی عبید اللہ صاحب ابن مولوی حافظ غلام رسول صاحب وزیر آبادی۔

۲۔ چوہدری فضل احمد صاحب ابن چوہدری گنج خان صاحب، متوطن منڈوعہ ضلع ہوشیار پور۔

۳۔ ماسٹر نذیر خان صاحب متوطن ضلع کانگڑہ۔

مولوی عبید اللہ صاحب مدرسہ احمدیہ کے ہوشیار اور بہت دیندار فارغ التحصیل طلباء میں سے تھے چونکہ اس وقت مبلغین کی بڑی قلت تھی۔ اس لئے جب ماریشس میں دوسرا مبلغ بھیجنے کی ضرورت پیش آئی

تو حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ تعالے نے ان کو تجویز فرمایا اور وہاں بھیجدیئے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی اہلیہ کو ان کے والد صاحب جا کر چھوڑ آئے، آخر انہوں نے وہاں ہی وفات پائی اور ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہو رہے ۔

چوہدری الفضل احمد صاحب ایف اے تک تعلیم یافتہ تھے، بڑے جوشیلے اور مخلص احمدی تھے۔ کچھ عرصہ انہوں نے مضمون نویسی کی مشق کی، حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ تعالے کی راہ نمائی اور ہدایت کے مطابق کی مگر چل نہ سکے، اس وجہ سے ایڈیٹوریل سٹاف میں کام کرنے کی بجائے مینیجر بنا دیئے گئے اور پھر ان کو تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ٹیچر لگا دیا گیا۔

ماسٹر نذیر خان صاحب میٹرک پاس تھے۔ انکی خواہش تھی کہ بی اے تک تعلیم حاصل کریں، اس کے لئے انہیں الفضل کے کام سے فارغ کر دیا گیا اور تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ مگر ایف۔ اے کرنے کے بعد وہ ایسے سخت بیمار ہو گئے کہ انکی جان کے لالے پڑ گئے۔ کافی عرصہ کے بعد وہ صحت یاب تو ہو گئے مگر صحت کو ایسا دھکا لگا کہ کوئی زیادہ محنت مشقت کا کام کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اور آزادانہ اپنا تجارتی کاروبار کرنے لگے جس میں اچھی ترقی کی۔ افسوس انقلاب قادیان میں ان کا سب کچھ ضائع ہو گیا اور عسرت میں ۱۹۵۱ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں فوت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؏

جن دنوں حضور مجھے مضمون نویسی سکھانے کے لئے نوٹ لکھایا کرتے ان ایام میں حضور مجھ پر اس قدر شفقت اور نوازش فرماتے کہ جو تمام عمر میرے لئے سرمایۂ افتخار اور باعثِ حیرت بنی رہی جیسا کہ کئی جگہ میں ذکر کر چکا ہوں۔ میری علمیت بہت ہی معمولی تھی، مجھ سے کئی غلطیاں سرزد ہوتیں اور متعدد غلطیاں سرزد ہوئیں مگر کبھی حضور نے مجھے سرزنش نہ کی بلکہ مسکراتے ہوئے نہایت نرمی اور شفقت سے سمجھاتے اور اصلاح فرما دیتے۔

کبھی لکھتے لکھتے میری پنسل گھس جاتی یا ٹوٹ جاتی تو اپنے پاس سے اپنڈی پنڈنٹ قلم یا پنسل عنایت فرما دیتے۔ کوئی بات سمجھ نہ آتی تو ایسے مشفقانہ انداز سے سمجھاتے کہ دل پر نقش ہو جاتی۔ مجھے یاد نہیں کہ ان ایام میں کبھی کسی معمولی غصہ یا خفگی سے پیش آئے۔ حضور مجھے نوٹ لکھاتے ہوئے دوران خود مطالعہ اور تحریر کے دوسرے کاموں میں بھی مصروف رہتے اور مجھے بھی لکھاتے جاتے۔

حضور کا معمول تھا کہ فل سکیپ سائز کے دُہرے تختے کے احتیاط سے سرے ملا کر درمیان میں شکن ڈال لیتے اور پھر نصف حصہ خالی چھوڑ کر نصف حصے پر مضمون رقم فرماتے، مجھے بھی ایسا ہی کرنے کی ہدایت تھی۔ اور میں ہمیشہ اس پر کاربند رہا۔ اس وقت بھی جب مجھے مضمون لکھ کر کاتب کے بھی حوالہ کرنا ہوتا تھا جو مضمون کے انتظار میں پاس کھڑا ہوتا تھا۔ اور اس کے نظرثانی کرنے کی بھی فرصت نہ ہوتی تھی۔

خلافت ثانیہ کے پہلے سال جب جلسہ سالانہ آیا تو اس وقت

تک میں حضور کی تقریریں اور خطبات قلمبند کرنے کی مشق ایک حد تک کر چکا تھا۔ حضور کی جلسہ سالانہ کی تقریریں قلمبند کرنے کا کام میرے ذمہ لگایا گیا چنانچہ میں نے تقریریں قلم بند کیں اور مرتب کر کے حضور کی خدمت میں پیش کر دیں۔ حضور نے نظر ثانی فرمائی اور کتاب کی شکل میں شائع کی گئیں۔ پھر سالہا سال تک میں یہ فرض ادا کرتا رہا۔

خلافت ثانیہ کے تیسرے یا چوتھے جلسہ سالانہ کا ذکر ہے۔ اُس وقت جلسہ مسجد نور کے صحن میں ہوا کرتا تھا اور ارد گرد گیلریاں بنوا لی جاتی تھیں۔ جنوب کی طرف سٹیج ہوتی تھی جو جلسہ گاہ سے کچھ اونچی تھی، اس دفعہ جلسہ میں پہلے کی نسبت زیادہ لوگ آئے۔ گیلریاں اور جلسہ گاہ خوب بھر گئی۔ سٹیج پر تھوڑے ہی لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی۔ میں حضور کے قدموں میں بالکل قریب بیٹھ کر تقریر قلم بند کیا کرتا تھا، لیکن اس دفعہ سٹیج اتنی کھچا کھچ بھر گئی کہ میرے لئے لکھتے ہوئے تیزی سے ہاتھ چلانا مشکل ہو گیا اور لکھنے میں روکاوٹ پیدا ہونے لگی۔ اس مشکل کا اظہار میں نے حضور سے کیا۔ اور حضور نے فرمایا، میز کے اوپر بیٹھ جاؤ۔ چنانچہ میں میز کے اوپر چڑھ بیٹھا اور ساری تقریر وہیں بیٹھ کر لکھی۔

جیسا کہ میں ذکر کر آیا ہوں حضرت میر صاحب نے جو مبلغین کلاس بنائی اور جس کو آپ تقریروں کی مشق بھی کرایا کرتے تھے اس میں ہم دو طلباء کو یعنی مجھے اور عبد محمد کو خلافتِ ثانیہ کے پہلے جلسہ سالانہ میں تقریر

کرنے کے لئے پیش کیا گیا اور اس کی منظوری حاصل ہو گئی۔ چنانچہ میں
نے "خلافت کی صداقت" پر جلسہ سالانہ پر تقریر کی سا تھے بڑے مجمع
میں سب سے پہلی تقریر تھی اور آخری بھی۔ جلسہ کی روئداد میں میری تقریر
سیف اللہ احمد جناب قاضی اکمل صاحب نے شائع فرما دیا۔ اس کے بعد پھر تو
مجھے تقریر کرنے کی مشق کا موقعہ ملا اور نہ ہی میرے دل میں اس کا کچھ شوق
تھا۔ مضمون نویسی کی طرف طبیعت مائل تھی، اور اس کے لئے آخر تک
ساری جدوجہد مخصوص رکھی۔

متاہلانہ زندگی کا انتظام

خلافت ثانیہ کے پہلے ہی سالانہ جلسہ کے موقعہ پر میری
متاہلانہ زندگی کا انتظام ہو گیا اور وہ بھی نہایت عجیب غریب طریق سے
او محض حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی ذرہ نوازی اور غیر معمولی
نوازش کی وجہ سے۔ واقعہ یہ ہوا کہ حضور نے اپنے جلسہ سالانہ کی تقریر میں
جماعت کو ضروری ہدایات دیتے ہوئے ایک بات یہ بھی فرمائی کہ چونکہ
جماعت کو رشتہ ناطہ کی بہت مشکلات درپیش ہیں۔ ہم غیر احمدیوں کو
لڑکی نہیں دے سکتے مگر غیر احمدی قابل اور لائق لڑکوں کو رشتے دے دیتے
ہیں، اس لئے احمدی لڑکیوں کے رشتہ کی مشکلات اور بڑھ گئی ہیں۔
ہمیں چاہیئے کہ ہم غیر احمدیوں میں لڑکوں کے رشتے نہ کریں بلکہ احمدیوں میں
ہی کریں تا کہ رشتہ ناطہ سے متعلق جماعت کی تکالیف کم ہوں۔

اتفاق سے انہی دنوں میرے رشتے کے متعلق والدہ ماجدہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں سلسلہ جنبانی فرما رہی تھیں۔ اگرچہ میری قادیان کی رہائش کی وجہ سے وہ لوگ بہت بدکے ہوئے تھے تاہم وہ قریب قریب آمادہ ہو چکے تھے۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تقریر میں نے امرتسر میں سنی اور جلسہ ختم ہونے پر سکالا پر آ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ والدہ ماجدہ کی خدمت میں خط لکھ دیا کہ آپ میری شادی کے متعلق کوئی انتظام نہ کریں کیونکہ ہم کو غیر احمدیوں کے ہاں شادی کرنے کی ممانعت ہو گئی ہے۔ قادیان سے اگرچہ ڈاک دوپہر کو نکلتی تھی لیکن میں نے خط لکھ کر اسی وقت لیٹر بکس میں ڈال دیا اور خود مہمان خانہ کی طرف گیا۔ اپنے ایک دوست محمد شفیع صاحب سیکرٹری جماعت احمدیہ مہمان خانہ سے ملنے کے لئے مدرسہ احمدیہ کی طرف روانہ ہوا جہاں جماعت احمدیہ مدھانہ کشمیری ہوتی تھی۔ میں احمدیہ چوک سے چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ کتب خانہ کے پاس مجھے ایک صاحب ملے جن کا نام قریشی امیر احمد تھا اور حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے برادر زادہ تھے، قادیان میں رہائش رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا، تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ انہوں نے کہا۔ کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا جب خدا تعالیٰ کوئی سامان کرے گا ہو جائے گی۔ وہ کہنے لگے تم اپنی رہائش گاہ کو جاؤ، میں ایک صاحب کو بھیجتا ہوں، اس کے بعد جو صورت ہو گی وہ میں تم کو بتاؤں گا۔ میں نے کہا بہت اچھا، اور میں واپس اپنی رہائش گاہ میں آگیا جو نواب صاحب کی مسجد مبارک کے

قریب عالی شان عمارت میں تھی اور وہیں "الفضل" کا دفتر تھا جس میں میں کام کرتا تھا۔

میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ایک صاحب معمر تشریف لائے اور رقعہ لکھنے کے لیے مجھ سے کاغذ اور قلم طلب فرمایا۔ چونکہ جلسے کے ایام تھے۔ مہمان کثرت سے ادھر ادھر آتے جاتے تھے۔ الفضل کے دفتر میں بھی ان کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ اور قلم پیش کیا۔ انہوں نے کچھ لکھا اور چلے گئے۔ صبح کو مجھ کو معلوم ہوا کہ ان کا نام مرزا محمود بیگ ہے۔ پٹی ضلع لاہور کے مشہور خاندان کے فرد ہیں اور گوجرہ ضلع لائلپور ہائی سکول میں ٹیچر ہیں۔ وہ معاملہ کو اب حضرت صاحب کی خدمت میں پیش کریں گے۔ بعض اور رشتے بھی ان کے مدنظر ہیں۔ پھر حضرت صاحب جو کچھ فرمائیں گے اس پر عمل کریں گے۔

یہ حالات سن کر مجھے اپنے متعلق بہت کچھ مایوسی ہوئی کیونکہ میں ان باتوں سے محروم تھا جو ایسے موقعوں کے لیے ضروری سمجھی جا سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں میں تن تنہا تھا۔ کوئی میری کسی قسم کی ذمہ داری اٹھانے اور میرے لیے کوشش کرنیوالا نہ تھا۔ میری ذاتی کوشش اول تو کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ دوسرے اس کی موزونیت بھی مخدوش تھی تاہم مجھے یہ خیال ضرور تھا کہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ سے مجھے کچھ شرف نیاز حاصل ہے۔ میں حضور سے عرض کروں گا اور مجھے توقع تھی کہ اگر میں اس رشتہ کے قابل سمجھا گیا اور حضور نے اسے میرے لئے موزوں خیال فرمایا تو حضور ضرور میرا خیال رکھیں گے۔

اس بناء پر میں نے ان صاحب کے مشورہ سے جنہوں نے پہلے پہل مجھے اس سلسلہ میں مخاطب کیا تھا حضور کی خدمت میں رقعہ لکھا اور بڑی جرأت کر کے حضور کے دستِ مبارک میں دے دیا جبکہ حضور مسجد مبارک میں نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ ایک آدھ دن مشورہ ہوتا رہا۔ مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے اچھے اچھے رشتوں کے مقابلہ میں مجھ میں کوئی بھی خوبی نہ ہونے کے باوجود حضور میرے حق میں ہیں۔ آخر حضور نے دوسرے یا تیسرے دن مسجد مبارک میں عصر کی نماز پڑھا کر اندر تشریف لے جاتے ہوئے مجھے فرمایا کہ استخارہ کر لو، کل تمہارا نکاح پڑھا دیں گے۔

میں ہکا بکا سا رہ گیا اور خوشی کی بجائے ایک قسم کا فکر لاحق ہو گیا کہ اب کیا ہو گا۔ میرا خیال تھا کہ اس معاملہ کے طے ہونے اور آخری فیصلہ تک پہنچنے تک کچھ عرصہ لگے گا، اب جبکہ اتنی جلدی سارے مراحل طے ہو گئے تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں قاضی اکمل صاحب کے پاس گیا اور سارا ماجرا سنایا، انہوں نے مجھے تسلی دی اور فرمایا۔ ممکن ہے لڑکی کو استانی جی جانتی ہوں۔ (استانی سکینۃ النساء صاحبہ قاضی صاحب کی اہلیہ محترمہ) ان سے پوچھ کر تمہیں حالات بتا سکوں گا مگر اتنی جلدی مشکل ہے، آجکل وہ جلسہ کی وجہ سے بہت مصروف ہیں۔ فی الحال اگر تم حضرت صاحب سے یہ کہہ سکو کہ دیکھنے کا مرحلہ باقی ہے، تو ممکن ہے حضور کچھ دنوں کے لئے نکاح کا اعلان ملتوی فرما دیں۔

حضور سے یہ بات کہنی تو بڑی مشکل تھی لیکن جب مجھے بتایا گیا کہ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے، اور یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں تو میں نے

اسی دن مغرب کی نماز کے وقت حضور سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مافی الضمیر کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ حضور میرا ایک آدھ لفظ سن کر میری بات فوراً سمجھ گئے اور فرمایا۔ "لڑکی بیں نے دیکھی ہوئی ہے۔"

دوسرے دن حضور نے عصر کی نماز کے بعد مسجد مبارک میں خود خطبہ نکاح پڑھتے ہوئے نکاح کا اعلان فرمایا۔ اس مبارک خطبہ کا ایک فقرہ مجھے ابھی تک یاد ہے جو مہر کے ذکر میں حضور نے فرمایا اور وہ یہ تھا کہ دونوں فریقوں نے مہر کی تعیین مجھ پر رکھی ہے اور میں دو سو روپیہ مہر مقرر کرتا ہوں اگرچہ لڑکے کی موجودہ حیثیت کے لحاظ سے یہ بھی زیادہ ہے مگر میں اسے اخبار کا کام سکھا رہا ہوں۔ امید ہے وہ اچھی ترقی کر سکے گا۔ آخر دو چار روپیہ کے چھوہاروں پر نکاح ہو گیا۔

اس وقت میری حالت یہ تھی کہ الفضل کے دفتر میں میری رہائش تھی۔ دو تین برتن، چارپائی، بستر اور ایک ٹرنک ساری جائداد تھی۔ کھانے کا کوئی مستقل انتظام نہ تھا۔ کبھی کہیں سے کبھی کہیں سے۔ کسی سے اتنے تعلقات نہ تھے کہ ان کے ہاں ایک دن کا کھانا پکانے کا انتظام کر سکتا۔ ان حالات میں قریشی امیر احمد صاحب نے ہی یہ مہربانی فرمائی کہ حضرت مرزا صاحب کے تعارف کرانے کے لئے انکی اور میری دعوت اپنے ہاں کی اور ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا اور وہ بھی دفتر اخبار "بدر" کی کٹیا کے ایک کونہ میں کیونکہ قریشی صاحب کا رہائشی مکان ایسا نہ تھا جس میں ہم دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش نکل سکتی۔ اس سے اس وقت کی قادیان میں مکانات کی مشکلات

کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک طرف تو حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار کی یہ حالت اور دوسری طرف سلسلہ کے آرگن اور با اثر اخبار کے دفتر کی یہ کیفیت۔ پھر چند ہی سالوں میں بڑے بڑے محلے آباد کر دیئے۔ بڑے فراخ اور آرام دہ مکانات عطا کر دیئے۔ بجلی اور پانی کی سہولتیں عنایت فرما دیں۔ اور ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہم کو قادیان سے نکالا گیا اس وقت قادیان عروس البلاد کہلانے کا مستحق بن چکا تھا۔

اللہ اللہ! کیا ہی مبارک زمانہ اور کیسے مخلص انسان تھے۔ مرزا صاحب اپنی بھانجی کا (جس کی خاطر انہوں نے غیر احمدی اور سخت مخالف رشتہ داروں سے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور جس کا رشتہ کسی احمدی سے کرانے کے لئے انہوں نے اپنی اہلیہ صاحبہ کی بھی پروا نہ کی کیونکہ وہ انکی بیوی کے بھائی سے منسوب کر دی گئی تھی جو غیر احمدی تھا) آپ محض احمدیت کے لئے اس کا نکاح ایک ایسے لڑکے سے کرنے پر رضامند ہو گئے جس کی دنیوی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ اور اس سے بھی پہلا تعارف نکاح کا اعلان کرا دینے کے بعد آپ نے کیا۔ پھر خدا تعالیٰ نے اس نکاح میں برکت بھی ایسی ڈالی کہ کسی چیز کی کمی نہ رہی۔

مجھے نکاح ہو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ جو صاحب نکاح کا ذریعہ بنے ان کا حضرت مرزا محمود بیگ صاحب سے رشتہ داری کا تعلق تھا اور وہ یہ کہ ان کے بڑے بھائی قریشی عبدالحق صاحب کی شادی حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ نے حضرت مرزا صاحب کی دوسری بھانجی اور میری اہلیہ کی

بڑی ہمشیرہ سے کی ہے اس وجہ سے قریشی امیر احمد صاحب کی میرے رشتہ میں امداد بہت موثر ثابت ہوئی۔

قریشی عبدالحق صاحب اس وقت شاہ کوٹ ضلع شیخوپورہ میں سب پوسٹ ماسٹر تھے، ان کا ذکر سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے مجھے احمدیت میں ایسے رشتہ دار عنایت فرمائے ہیں۔

اعلان نکاح کے بعد حضرت مرزا صاحب بھی تشریف لے گئے اور یہ فرما گئے کہ رخصتانہ کے متعلق وہ خود اطلاع دیں گے۔ اور چونکہ بعض رشتہ داروں کی طرف سے مخالفت اور فتنہ کا خطرہ ہے۔ خاص طور پر انکی بھابھی کی دادی صاحبہ جو حضرت مرزا صاحب کی نانی تھیں اور احمدی نہ تھیں اس بات کے سخت خلاف تھیں کہ لڑکی کا رشتہ اپنے خاندان سے باہر کیا جائے۔ اور وہ بڑی پوتی کا رشتہ احمدیوں میں ہو جانے کی وجہ سے چھوٹی پوتی کے متعلق بہت احتیاط کرتی تھیں اور کسی وقت بھی اسے اپنے سے جدا نہ کرتی تھیں، اس وجہ سے انہوں نے چھوٹی سی عمر میں بلوغت سے پہلے ہی اپنے خاندان میں حضرت مرزا صاحب کے سالے کے ساتھ اسے منسوب کر رکھا تھا اور اپنے گھر کا سامان پوتی کے جہیز کے طور پر ان کے گھر پہنچا دیا تھا۔ لیکن وہ پوتی کے بغیر بالکل اکیلا رہ گئی تھیں۔ ان کے خاوند جو آپ کی رئیسانہ شان میں رہتے تھے اور کسی وارث کے نہ ہونے کی وجہ سے زمین فروخت کر کے خود بھی استعمال کرتے اور غرباء کی مدد بھی کرتے تھے، فوت ہو چکے تھے۔ ان کا بیٹا اور میری اہلیہ کے والد صاحب جو اکیلے ہی تھے ان سے بھی پہلے فوت

ہو چکے تھے اور کوئی نرینہ اولاد نہ چھوڑی تھی ۔ انکی اہلیہ صاحبہ جو حضرت مرزا صاحب کی ہمشیرہ تھیں پہلے فوت ہو چکی تھیں ۔ غرض میری اہلیہ اور انکی دادی صاحبہ کے سوا تمام خاندان کا خاتمہ ہو چکا تھا ۔

حضرت مرزا صاحب چاہتے تھے کہ نکاح کر دینے کی اطلاع ان کے خاندان کو نہ پہنچے اور کسی موقعہ پر وہ خود لڑکی کو قادیان لے آئیں اور رخصت نہ کر دیں ۔ لیکن کسی نہ کسی طرح یہ اطلاع ان کے خاندان میں پہنچ گئی ۔ اور ایسے رنگ میں پہنچی کہ خاندان کے جو افراد اس بارے میں ان کے حامی ہو سکتے تھے ان کو بھی افسوس ہوا ۔ خاص کر مستورات نے بہت چہ میگوئیاں کیں کیونکہ ان کو یہی بتایا گیا کہ مرزا صاحب نے پچاس سالہ بوڑھے سے لڑکی کا نکاح کر دیا ہے جو مسجد میں خادم کے طور پر کام کرتا ہے اور لوگوں کے گھروں کی روٹیوں پر اس کا گزارہ ہے ۔

حضرت مرزا صاحب تو ان باتوں سے ناواقف دو چار روز پٹی رہ کر گوجرہ ضلع لائلپور چلے گئے ۔ لیکن جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے پیچھے خاندان میں بہت کھلبلی مچی اور حالات بہت پیچیدہ ہو جاتے اگر مرزا صاحب کے برادر اصغر مرزا سلطان احمد صاحب کے دل میں خدا تعالٰی انکی تائید اور حمایت کرنے کا جذبہ نہ ڈال دیتا ۔ جناب مرزا صاحب قادیان میں تعلیم پاتے رہے تھے اور بچپن سے نہایت جوشیلے اور مخلص احمدی تھے ۔ انہوں نے حضرت مرزا صاحب سے کہہ رکھا تھا کہ جہاں بھی آپ میرا رشتہ کر دیں گے میں منظور کر لوں گا ۔ چنانچہ جب حضرت مرزا صاحب نکاح کرنے کے بعد پٹی گئے ، تو

ان سے ساری کیفیت بیان کر دی۔ اور انہوں نے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات
نہیں ہے میں ہر طرح آپ کا ساتھ دوں گا۔

جناب مرزا صاحب اپنے خاندان میں اتنا اثر و رسوخ رکھتے تھے کہ
کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے سامنے کھڑا ہو سکے، اس لئے کسی بڑی پیچیدگی
کا تو خطرہ نہ تھا۔ البتہ دادی صاحبہ کا معاملہ ذرا مشکل تھا اور ان کے شور و غوغا
کو روکنا محال تھا، اس لئے رخصتانہ کے متعلق یہی تجویز ہوئی کہ خاموشی سے
قادیان میں کر دیا جائے۔ اس کے لئے حضرت مرزا صاحب نے مارچ کی کوئی
تاریخ مقرر کی۔

نکاح کا اعلان ہو جانے کے بعد ضروری تھا کہ میں والدہ ماجدہ کو
بھی اس کی اطلاع دیتا اور ان سے دعا کی التجا کرتا کیونکہ میں تو بالکل تہی
دست تھا۔ مگر رشتہ سے انکاری خط لکھنے کے بعد اتنی جلدی یہ واقعہ رونما
ہو گیا کہ مجھے اس کی اطلاع دیتے ہوئے کچھ حجاب سا محسوس ہونے لگا اس لئے
کہ والدہ صاحبہ شاید یہ خیال فرمائیں کہ میں نے سب کچھ طے کر لیا اور انکو پہلا
خط انکار کا لکھا تھا۔ حالانکہ جس وقت میں نے پہلا خط لکھا اس وقت میرے
وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی لیکن ان کے
سوا میرا تھا بھی کون جو ایسے معاملہ کو سر انجام دے سکتا۔ چنانچہ میں نے تفصیل
کے ساتھ سارے حالات لکھ دیئے اور میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے میرے
خط کے جواب میں بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور جہیز کی امداد دینے کے متعلق تسلی
دی، اور خدا تعالیٰ کے فضل سے کافی امداد دی، باوجود اس کے کہ عرصہ سے

بیوگی کی مصیبت میں مبتلا تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا۔
میرے تایا صاحب جو بڑے شدید احمدیت کے مخالف تھے، اور
اب میرے قادیان چلے جانے کی وجہ سے انکی مخالفت میں صرف اتنی تبدیلی
ہوگئی تھی کہ انھوں نے خموشی اختیار کرلی تھی اور کسی مخالفانہ شور و شر میں حصہ
نہ لیتے تھے، ان پر بھی میری شادی کا بہت اچھا اثر ہوا اور وہ دبے الفاظ
میں احمدیوں کی طرفداری کرنے لگے۔ نیز اس بات پر آمادگی کا اظہار کیا کہ میرے
رخصتانہ کے موقعہ پر قادیان آئیں گے۔ والدہ ماجدہ نے خدا تعالیٰ ان پر
ہزاروں ہزار رحمتیں اور برکتیں نازل کرے! معلوم نہیں کس طرح مگر
شادی کے لیے بہت اچھا انتظام فرمایا اور اچھی تیاری کی۔
جب رخصتانہ کی تاریخ مقرر ہوگئی تو میں نے والدہ صاحبہ کی خدمت
میں لکھا کہ فلاں تاریخ تک تشریف لے آئیں۔ والدہ صاحبہ سونے چاندی کا زیور
گھر سے ضروری برتن اور کچھ نقد روپیہ لے کر چند روز قبل قادیان پہنچ گئیں،
اور تایا صاحب بھی ان کے ساتھ آگئے۔ ضروری پارچات انھوں نے
قادیان میں آکر تیار کرالئے۔ تایا صاحب کو جماعت احمدیہ کے متعلق پہلے
ہی کوئی ایسا حسن ظن نہ تھا اور ان کے دل میں پہلے ہی دن سے یہ خدشہ
پیدا ہوچکا تھا کہ اتنے اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہمارے بے سر و سامان لڑکے کے
ساتھ کس طرح منسوب ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے اس میں بھی کوئی دھوکہ ہو
اور جب مقررہ تاریخ پر حضرت مرزا صاحب تشریف نہ لاسکے تو وہ بہت ہی
گھبرا گئے۔ بے چینی تو والدہ صاحبہ کو بھی بہت ہوئی۔ مگر وہ بڑے دل گردہ

کی خاتون تھیں۔ علاوہ ازیں آتے ہی انہوں نے دارِ مسیح موعود علیہ السلام میں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے دن جب انہوں نے حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کی زیارت کی اور اپنے ساتھ ان کا نہایت ہی شفقتانہ سلوک دیکھا تو آکر مجھے فرمایا۔ "بڑی بیوی کے چہرے پر اس قدر نور برستا ہے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ اور باتیں ایسی اچھی کرتی ہیں کہ ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان کے علاوہ خاندان کی دوسری خواتین بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ ان کے حسن سلوک، حلیمانہ برتاؤ اور شیریں گفتگو کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ وہ مجھ جیسی دیہاتی عورتوں سے بھی اس محبت اور احترام سے پیش آتی ہیں کہ میں حیران رہ جاتی ہوں۔ میں آج احمدیت کی صداقت کا اقرار کر کے وہاں سے آئی ہوں"۔

ان حالات میں انہوں نے اپنی بے چینی کا ذکر وہاں کیا تو انہیں ہر طرح تسلی دی گئی اور کسی قسم کے شک و شبہ کا احتمال باقی نہ رہنے دیا۔ آخر تایا صاحب تو یہ کہہ کر واپس چلے آئے کہ اب میں گاؤں والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا میں گاؤں میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہا۔ مگر والدہ صاحبہ اطمینان سے ٹھہر گئیں۔ اس دوران میں حضرت مرزا صاحب کا خط حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ کی خدمت میں پہنچ گیا کہ خاندانی الجھنوں کی وجہ سے میں مقررہ تاریخ پر نہ آسکا، اب تاریخ کا تعین کئے بغیر میں جلدی ہی آنے کی کوشش کروں گا۔ والدہ صاحبہ کو اس سے مزید تسلی ہو گئی۔

انہی دنوں حضرت میر محمد اسحٰق صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ مبلغین

کلاس کے چند طلبار کو انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ دیکھنے کا موقعہ دینا چاہیئے جو تمام مسلمانان پنجاب کی واحد فعال انجمن تھی، آپ نے اس کی منظوری حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ سے حاصل کر لی۔ جانے والے طلباء میں میرا نام بھی شامل تھا۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر ہم پانچ چھ طلبا آپ کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گئے۔ ان دنوں قادیان میں ریل نہ تھی۔ تانگہ یا موٹر بھی نہ تھی بلکہ پرانی طرز کے یکے چلا کرتے تھے اور بٹالہ جا کر ریل گاڑی ملا کرتی تھی جب ہم بٹالہ پہنچے تو مجھے حضرت میر صاحب نے ٹکٹ خریدنے کے لئے بکنگ آفس بھیجا اور خود دوسرے طلبار سمیت پلیٹ فارم پر تشریف لے گئے۔

جب میں ٹکٹ لے کر آیا تو مسکراتے ہوئے فرمایا۔ تمہارے تو مہمان اس گاڑی سے اترے ہیں۔ (اس وقت امرتسر اور پٹھانکوٹ کی گاڑی کا بٹالہ کراس ہوا کرتا تھا)، اور تم جلسہ دیکھنے جا رہے ہو۔ میں نے کھسیانہ ہوتے ہوئے صرف اتنا پوچھا کتنے مہمان تھے۔ فرمایا۔" دو کو تو میں پہچانتا ہوں۔ مرزا محمود بیگ اور مرزا سلطان احمد تھے، مگر تیسرا مہمان برقعہ میں تھا۔"

اس وقت پٹھانکوٹ کی طرف سے گاڑی آنے ہی والی تھی، اتنے میں وہ آ گئی اور ہم سوار ہو کر لاہور روانہ ہو گئے، جہاں ہمیں آٹھ دس روز لگ گئے۔ حضرت میر صاحب نے ہمیں حمایت اسلام کے جلسہ کے بعد شالامار، مقبرہ جہانگیر وغیرہ مقامات کی سیر کرائی۔ اور کیا ہی پُر لطف سیر کرائی جس کی یاد ساری عمر نہ بھولی۔ حضرت میر صاحب کا ہنس مکھ چہرہ، بے حد شفقت، کھانے پینے میں فراخدلی اور سیر چشمی خاص پایہ رکھنے کے باوجود ہم طلباء سے

بے تکلفی ہمارے لئے آیۂ رحمت تھی۔

ایک دن شام کا کھانا انارکلی کے ایک ہوٹل میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانے کے بعد جب جائے قیام کے لئے روانہ ہوئے جو حضرت میاں چراغ دین صاحب کی بیٹھک میں تھی تو آپ نے دو سیر گنڈیریاں لینے کا ارشاد فرمایا۔ مہر محمد خان نے جو ہم طلباء میں سے ایک تھا اپنے دامن میں ڈلوائیں اور جلدی جلدی ایک ٹانگہ میں بیٹھ کر اور باقی لڑکوں کو سوار کرا کے روانہ ہوگیا۔ میں اور حضرت میر صاحب پیچھے رہ گئے۔ حضرت میر صاحب نے مجھے فرمایا، ان لوگوں نے ہم سے چالاکی کی ہے۔ ہمارے پہنچنے تک گنڈیریاں ختم کر دیں گے، آؤ ہم بھی ان سے چالاکی کریں اور تانگہ لے کر سینما کو روانہ ہوگئے۔ گنڈیریاں ختم ہونے تک یہ لوگ بڑے خوش رہے، لیکن پھر انہیں کچھ تشویش ہوئی اور آخر کار افسوس کیا کہ کیوں بھاگ آئے تھے۔ اس وقت سینما دیکھنے کی سلسلہ کی طرف سے ممانعت نہ تھی۔ غرض چند دن ہم نے لاہور میں گزارے۔

اسی دوران میں والدہ صاحبہ نے قادیان کے طریقِ رخصتانہ سے ناواقفیت کی وجہ سے کوشش کی کہ بہو کو اپنے پاس لے جائیں۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان کی خواتین نے صحیح اور اسلامی طریق بتایا اور آپ خاموش ہوگئیں۔ پھر جس روز میں قادیان پہنچا اس دن والدہ ماجدہ چند عورتوں کو ہمراہ لے کر زیور اور پارچات لے گئیں اور بہو کو ساتھ لے آئیں۔ والدہ صاحبہ حضرت مرزا محمدؐ اشرف صاحب کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس موقعہ پر بھی حضرت مرزا صاحب اور ان کے اہل و عیال نے ہمارے ساتھ

نہایت ہی اعلیٰ حسن سلوک کیا۔

دوسرے تیسرے روز جب حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالےٰ کو اطلاع ہوئی تو حضور نے مجھے لکھا۔ میری اطلاع کے بغیر ہی عورتوں نے لڑکی کو رخصت کر دیا۔ میرا ارادہ خود انتظام کرنے اور کچھ امداد دینے کا تھا۔ اور دعا فرمائی کہ خدا تعالےٰ مبارک کرے۔ اور ضروری اخراجات کے لئے ایک رقم بھی عنایت فرمائی۔

والدہ ماجدہ پر قادیان تشریف لانے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خاندان کی خواتین مبارکہ خصوصاً حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کو دیکھنے اور باتیں سننے کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے احمدیت قبول فرمالی تھی۔ اور چند روز بعد حضرت مرزا محمد اشرف صاحب کے اہل وعیال جب وطن جانے کے لئے تیار ہوئے تو آپ بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئیں اور میں نے خانگی زندگی کا تجربہ شروع کیا۔

حضرت مرزا محمد اشرف صاحب نے اہل وعیال کے چلے جانے کی وجہ سے سارا گھر میری اہلیہ کے سپرد کر دیا۔ وہ خود اور ان کا لڑکا جو سکول میں پڑھتا تھا اور بڑے ناز و نعمت سے اس کی پرورش کی جاتی تھی کیونکہ ان کا وہی ایک لڑکا تھا۔ میں اور میری اہلیہ چار کس تھے، کھانا اکٹھا ہی پکتا اور چند روز کی آئی ہوئی دلہن نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں سلیقہ اور عمدگی سے گھر کو سنبھال لیا۔ حضرت مرزا صاحب کے نہایت ہی اعلیٰ اخلاق، بزرگانہ شفقت اور مشفقانہ سلوک نے بھی اس کی بہت حوصلہ افزائی کی اور اسے نئی جگہ اور نئے آدمیوں میں آکر

ثابت کر دیا کہ اسنے نہایت شریف اور سلیقہ شعار خاندان میں پرورش پائی ہے۔
کچھ عرصہ تو ہم حضرت مرزا صاحب کے مکان میں ہی رہے، پھر جب ان کے اہل و عیال آ گئے تو مغلوں کے محلہ میں ایک چھوٹا سا مکان ہم نے کرایہ پر لے لیا۔ اس کے بعد ایک ایسا مکان مل گیا جس میں الفضل کا پریس تھا۔ اس کے اوپر کا حصہ میں نے اپنی رہائش کے لئے درست کرا لیا۔ مگر یہ مکان بالکل خام اور بہت بوسیدہ تھا۔ کئی خطرات بھی پیش آئے مگر ہمیں خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ہر طرح محفوظ رکھا اور ہم اس وقت تک اس میں رہے جب تک کہ خدا تعالیٰ نے اپنا ذاتی، وسیع اور شاندار مکان عنایت نہ فرما دیا۔ اور اس وقت بھی میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ اس تنگ، بوسیدہ اور خام مکان کو چھوڑ کر اپنے تو تعمیر پختہ اور وسیع مکان میں جا رہوں، کیونکہ سالہا سال وہاں رہنے کی وجہ سے اس جگہ سے خاص انس ہو گیا تھا۔ لیکن ایک دن جبکہ سکولوں کے طلباء، دفاتر کے کارکن اور دوسرے بہت سے لوگ ٹرپ منانے نہر پر گئے ہوئے تھے اور میں بھی ان میں شامل تھا، گھر والے اپنا مختصر سا سامان اٹھوا کر اپنے نئے مکان میں آ گئے۔ حالانکہ ابھی لپائی اور صفائی وغیرہ بہت کچھ باقی تھا۔ میں جب شام کے وقت ٹرپ سے واپس آتا ہوا اپنے مکان کے پاس سے گزرا تو مجھے اس میں زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔ اور جب میں اندر گیا تو معلوم ہوا کہ سارا گھر یہاں منتقل ہو چکا ہے۔ خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ اسنے محض اپنے فضل سے اتنا وسیع مکان عنایت کر دیا۔ ایک تو نہر پر کھیل کود میں مصروف رہنے کی وجہ سے

کافی تھکاوٹ تھی، دوسرے ایک نئی اور وسیع جگہ میں رات کو سویا۔ جب آنکھ کھلتی تو عجیب حیرت ہوتی کہ کہاں آ گیا ہوں اور خدا تعالیٰ کا شکر کرنے کا موقع ملتا۔

جس خام مکان کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس میں کچھ عرصہ رہائش اختیار کرنے کے بعد گرمی کے موسم میں ہمارا ارادہ وطن جانے کا ہوا۔ میں نے ایک ماہ کی رخصت حاصل کی اور ہم قادیان سے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں کاٹھ گڑھ کا اسٹیشن پڑتا تھا اور اس گاؤں میں میری بیوی کی ہمشیرہ رہتی تھیں کیونکہ قریشی عبدالحق صاحب پوسٹ ماسٹر تھے، وہاں ہم چند روز کے لئے ٹھہر گئے۔ ایک دفعہ پہلے ہم ان کے ہاں جا چکے تھے اور رسانگلہ ہل سے وہاں اتر کر جاتی تھی اور پھر وہاں سے اپنے وطن بلاتی اپنی اہلیہ سمیت پہلی دفعہ گیا تھا۔ شاہ کوٹ میں باتوں باتوں میں، ایک دن میری اہلیہ صاحبہ کو ان کی ہمشیرہ نے مذاقیہ رنگ میں کہا۔ ماموں صاحب نے تمہاری شادی قومیت کا خیال رکھے بغیر ایسی جگہ کر دی ہے کہ ہم اولادوں کی شادیاں آپس میں نہ کر سکیں گے میری اہلیہ صاحبہ نے تو اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب انہوں نے مجھے بتایا تو میں نے انکی ہمشیرہ سے کہا کہ آپ اس بات کا فکر نہ کریں، مجھ پر خدا تعالیٰ نے احمدیت کی برکت سے جب یہ فضل کیا ہے کہ مغل خاندان کی لڑکی عنایت کی ہے تو ہماری اولاد جس میں مغل خاندان کی لڑکی کی بھی آمیزش ہوگی اسے سید خاندان کی لڑکی عنایت کرے گا۔ یہ الفاظ ایسے مبارک وقت میں میرے منہ سے نکلے کہ سچ مچ خدا تعالیٰ نے میرے بچے

حمید احمد کو جس کی سب لڑکوں سے پہلے شادی کی گئی سید خاندان کی لڑکی سے شادی کرنے کا موقع ملا، اور وہ بھی ان حالات میں جبکہ ہم لٹ پٹ کر بے گھر ہو چکے تھے اور قادیان کے مقابلہ میں بہت ہی عسرت کی زندگی کھاریاں ضلع گجرات میں بسر کر رہے تھے۔ اور قادیان کے احمدی ساکنین جو آپس میں واقفیت رکھتے اور ایک دوسرے کے حالات جانتے تھے، تسبیح کے دانوں کی طرح سارے پاکستان میں اس طرح بکھر چکے تھے کہ ایک دوسرے کے متعلق یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کوئی کہاں سر چھپائے بیٹھا ہے۔ ان حالات میں خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ایسے غیر معمولی سامان پیدا کر دیئے کہ یہ رشتہ لڑکی والوں کی اپنی درخواست پر مہیا ہو گیا۔

میں ذکر کر رہا تھا کہ قادیان سے روانہ ہو کر ہم چند روز کے لیے کاٹھگڑھ ٹھیرے۔ دو چار روز ہی ہوئے تھے کہ ایک دوست کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ ہمارے رہائشی مکان کے اوپر کی چھت نچلی چھت پر گری، اور پھر دونوں چھتیں نیچے آ رہیں۔ مگر جس کوٹھری میں اسباب تھا وہ محفوظ رہی۔ برسات کا موسم نہ تھا۔ نہ کوئی اور حادثہ ہؤا بلکہ دونوں چھتیں یونہی گر گئیں، اور جس دن ہم قادیان سے روانہ ہوئے اسی دن گریں مگر اس وقت جب ہم مکان چھوڑ چکے تھے اور اس طرح خدا تعالیٰ نے ہمیں محفوظ رکھا۔ میں نے قادیان واپس آکر دونوں چھتیں نئی ڈلوائیں اور پھر اس میں رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد وہی شہتیر جو اوپر کی چھت میں نیا ڈالا گیا تھا خطرے کا الارم دینے لگا اور میں نے اسے تبدیل کر لیا۔ جب اسے دیکھا تو معلوم ہؤا کہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا

ہے۔ اور اگر تبدیل نہ کر لیا جاتا تو معلوم نہیں کیا رنگ لاتا۔

ان خطرات کے علاوہ مکان سے کئی بار سانپ بھی نکلے لیکن ہر موقعہ پر خدا تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ ایک دفعہ رمضان کے دن تھے اور گرمی کا موسم سحری کے وقت اٹھ کر میری اہلیہ صاحبہ چولہے میں آگ جلانے لگی تو قریب ہی پڑی ہوئی پیڑھی کے نیچے سے شوں کی آواز آئی، انہوں نے کچھ خیال نہ کیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد جب پیڑھی کو ذرا سرکایا تو پھر زیادہ زور کی آواز آئی انہوں نے مجھے جگا کر بتایا۔ میں نے لاٹھی کے ساتھ جب پیڑھی کو اٹھا کر دیکھا تو اچھا خاصا سانپ بیٹھا ہوا نظر آیا اور میں نے اسے مار دیا۔

ایک دفعہ میں دوپہر کے وقت ایک چھوٹی سی طاقی کے قریب لیٹا ہوا تھا۔ طاقی کی چھت کی درز میں سے میں نے سانپ کا ایک حصہ باہر نکلا ہوا دیکھا۔ میں اسے مارنے کی تجویز سوچ ہی رہا تھا کیونکہ وہاں اچھی طرح ضرب نہ لگائی جا سکتی تھی کہ سانپ نے اپنی دم باہر نکال کر ایک چھپکلی کو اس کی لپیٹ میں لے لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ چھپکلی کو اندر کھینچ لے میں نے اس کے اس حصہ کو چوٹ لگائی اور سانپ چھپکلی سمیت نیچے گر پڑا اور میں نے اس کا سر کچل دیا۔

چونکہ شادی کے بعد کئی سال تک ہمارے کوئی اولاد نہ ہوئی اس لئے بھی اپنا مکان بنانے کی خواہش پیدا نہ ہوتی۔ اور میں نے تو ارادہ کر لیا تھا کہ اگر یہی صورت رہی تو اپنا مکان بنانے کی ضرورت ہی نہیں اسی طرح زندگی بسر کر لیں گے۔ اولاد کے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے تو کوئی ایسا احساس

نہیں تھا لیکن میری اہلیہ صاحبہ کو بہت صدمہ تھا۔ مَیں انہیں تسلی دیتا، اور خاص کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک ارشاد سنایا کرتا جو میں نے اخبار "الحکم" کے کسی پرچہ میں بطور ڈائری چھپا ہوا پڑھا تھا اور جس کا یہ مفہوم تھا:-

"بہت لوگ اولاد کی بڑی خواہش رکھتے ہیں اور اس کے لئے بڑی بیتابی کا اظہار کرتے ہیں مگر اپنی حالت پر نظر نہیں کرتے کہ وہ کیسی ہے، کسقدر خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی مخلوق کے لئے کتنے مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے احکام پر نہیں چلتے اور اس کی مخلوق کے لئے مضرت رساں ہیں تو اپنے جیسی اولاد کی خواہش کرنے کا کیا فائدہ۔ پھر خدا تعالیٰ جسے چاہے اولاد دیتا ہے۔ اگر وہ کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اولاد کی پرورش کی ذمہ داری اس پر ڈالے تو اسے کڑھنے اور غم کھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس میں کیا شک ہے کہ اولاد بڑی نعمت ہے، اور عورت کی گود خالی رہنا اس کے لئے بڑا صدمہ ہے۔ میری اہلیہ اس صدمہ کو کم کرنے کے لئے کوشش کرتیں کہ کسی کا بچہ ہی پرورش کے لئے مل جائے۔ چنانچہ میری ہمشیرہ کی یتیم بچی کی پرورش کے لئے انہوں نے بڑی کوشش کی لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب میری ہمشیرہ کو اسکے سسرال والے قادیان لے گئے تو وہ بچی بھی ساتھ ہی چلی گئی۔ پھر انہوں نے میری دوسری ہمشیرہ کے لڑکے کو کہ وہ بھی یتیم تھا چھوٹی سی عمر میں اپنے پاس رکھ کر بچوں کی طرح پالا اور پڑھایا اور بعد میں ایک لمبے عرصہ تک فتر

"الفضل" میں کاتب کے طور پر کام کرتا رہا۔ اس سلسلہ میں میری اہلیہ صاحبہ نے بارہا یہ بھی کوشش کی کہ میں دوسری شادی کر لوں اور خدا تعالیٰ کے فضل سے میرے لئے کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ کیونکہ الفضل کی ایڈیٹری کا کام سرانجام دینے کی وجہ سے مجھے اتنی پوزیشن حاصل ہو چکی تھی کہ آسانی سے رشتہ مل سکتا تھا اور اہلیہ صاحبہ نے کئی رشتے خود تلاش کر کے مجھے بتائے مگر میں قطعاً آمادہ نہ ہوا اور وجہ یہ پیش کرتا کہ اگر پہلی شادی سے اولاد نہیں ہوئی تو پھر یہ ضروری نہیں کہ دوسری شادی سے ضرور اولاد ہو۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے زندگی کے دن نہایت اطمینان اور سکینت سے گزرتے گئے۔ اہلیہ صاحبہ نے باوجود گھر میں کسی بزرگ کے نہ ہونے کے، باوجود میری نازک مزاجی کے اور باوجود اوائل عمر کے گھر کے انتظام میں نہایت سلیقہ شعاری کا ثبوت دیا، اور میرے ساتھ اخلاص، محبت اور اطاعت کا بے نظیر نمونہ دکھایا۔ اور سب سے بڑھ کر میرے عیوب اور کمزوریوں کی ایسی پردہ پوشی کی کہ اپنی خوش بختی پر ساری عمر نازاں رہا۔ انہوں نے کبھی میری کوئی شکایت اپنے رشتہ داروں سے نہ کی، ان کے پوچھنے پر بھی کبھی نہ کی حتیٰ کہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ سے بھی کبھی نہ کی۔ اس کا ایک طرف تو یہ نتیجہ نکلا کہ ہماری اپنی زندگی کی بنیاد روز بروز استوار ہوتی گئی اور دوسری طرف ہر قسم کی برکات ہم پر نازل ہونے لگیں، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ کوئی خواہش میرے دل میں ایسی نہ رہی جسے خدا تعالیٰ نے پورا نہ فرمایا، بلکہ ہم پر ایسے ایسے انعامات کئے جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتے تھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ ٭

گھریلو معاملات کو جس خوش اسلوبی اور سلیقہ شعاری سے اہلیہ نے سر انجام دیا انہوں نے میری زندگی پر خاص اثر ڈالا، اور میرے دل میں انکی قدر و منزلت ایسی جاگزین ہوتی چلی گئی، اور ہماری زندگی زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ اس حد تک پہنچ گئی کہ اس میں کسی قسم کا رخنہ پڑنے کی گنجائش نہ رہی۔

مجھے اعتراف ہے کہ محض خدا تعالیٰ کے فضل سے اہلیہ کے اسقدر عقلمند دور اندیش اور صابر و شاکر ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اعلیٰ زندگی میں اخلاق اور معاشرت حسن سلوک اور رواداری تحمل اور برداشت کے اس مرتبہ پر نہ پہنچا سکا جس پر خدا تعالیٰ نے میری اہلیہ کو کھڑا کیا تھا، اور مجھ سی عادت اور فطرت کے ماتحت اور اپنے کام کی نزاکت اور دن رات کی مصروفیت کی وجہ سے بہت کوتاہیاں ہوتی رہیں، اور کئی قسم کی تکالیف کا موجب بنتا رہا لیکن اہلیہ کے طریقِ عمل میں نہ صرف کوئی ناگوار تغیر نہ آیا بلکہ اس کے حسن سلوک، درگزر اور پردہ پوشی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

حضرت صاحب میرے رنگ ڈھنگ خوب جانتے تھے، میری عادت اور خصلت کا کوئی پہلو آپ سے پوشیدہ نہ تھا۔ مجھے روزانہ کافی وقت حضور کی صحبت میں گزارنے کا موقعہ ملتا۔ حضور نے خود اور سیدہ امۃ الحی صاحبہ مرحومہ کے ذریعہ کئی بار اہلیہ سے دریافت بھی فرمایا کہ غلام نبی کی طرف سے کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ، لیکن خدا تعالیٰ اپنے خاص انعامات کا مورد بنائے اس خاتون کو اور اس کے ماں باپ پر فضل نازل کرے جنہوں نے اس کی پرورش کی! کہ

باوجود کئی قسم کی تکالیف کے استے ہمیشہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کو یہی جواب دیا کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے اور حضور کی نوازش سے ہر قسم کا آرام و آسائش حاصل ہے۔ اہلیہ کا یہی طریق عمل تھا جس کی وجہ سے مجھے ساری عمر کسی گھریلو معاملہ کے متعلق جوابدہی کے چھوٹے سے چھوٹے مرحلہ سے بھی دگزرنا پڑا۔ اہلیہ اپنے تمام رشتہ داروں کو بڑے ادب و احترام سے دیکھتی تھیں اُن سے بھی از خود تو الگ رہا ور دیا کرنے پر بھی کبھی کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا اور ہر حالت میں صبر و شکر کا بہترین نمونہ دکھایا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں کوئی بات کہی ہو خواہ وہ انکی طبیعت کے کتنی ہی خلاف ہو اور انہوں نے مان نہ لی ہو، جبراً نہیں بلکہ طوعاً۔ اور پھر کبھی اس کا احسان نہ جتایا۔ میرے مقابلہ میں کبھی گستاخانہ طریق اختیار نہ کیا۔ اگر میں کبھی کرخت اور اونچی آواز میں کسی بات کا اظہار کرتا، تو صحن سے اندر آجائیں اور کہتیں کہ جو کچھ کہنا ہو یہاں کہیں تاکہ ہمسائے نہ سنیں۔

یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب انکی عمر ۱۳ سال کی ہوگی اور میری ۱۶ سال کی اور پھر شادی پر چند ہی ماہ گزرے تھے پھر روز بروز غیر معمولی تغیر ہوتا گیا۔ اور محض خدا تعالیٰ کے فضل سے نہایت ہی خوشگوار زندگی حاصل ہو گئی۔ مگر محض اہلیہ کی عقل اور سمجھ۔ فہم و فراست کی وجہ سے نہ کہ میری کوشش سے۔

ابھی ابتدائی ایام میں میں نے کسی اخبار میں پڑھا کہ گورنمنٹ نے کچھ عورتوں کو ڈاکٹری سکھانے کا انتظام کیا ہے جنہیں مختلف کمیٹیوں کیطرف سے ڈاکٹری کورس ختم کرنے کے لئے وظیفہ ملے گا اور کم از کم تین سال وہاں کام کرنا ضروری ہوگا

اسکے متعلق میں نے پوچھا، انہوں نے ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ اس کے بعد میں نے حضرت صاحب سے ذکر کیا۔ حضور نے کوئی زیادہ پسندیدگی کا اظہار نہ فرمایا لیکن منع بھی نہ کیا۔

اس پر میں نے انسپکٹر جنرل سول ہسپتال پنجاب سے خط و کتابت کی اور جلدی ہی منظوری آگئی۔ میں اہلیہ کو لے کر لاہور گیا اور لیڈی ایچیسن ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ یہ اس وقت عورتوں کا بہت مشہور ہسپتال تھا۔ پردہ کا ضروری انتظام تھا۔ میری اہلیہ کے داخلہ کو متعلقہ حکام نے بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ کیونکہ مسلمان لڑکیاں شاذ و نادر ہی داخل ہوتی تھیں۔ ان کا قادیان سے آنا اور محض فن ڈاکٹری کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر ان کا داخل ہونا خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ان ایام میں گورنر کی اہلیہ نے ہسپتال کا معائنہ کیا، تو میری اہلیہ صاحبہ کو ان کے سامنے خاص کر پیش کیا گیا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں سے آئی ہیں اور لیڈی صاحبہ نے خوشی کا اظہار کر کے انکی حوصلہ افزائی کی۔

غرض حالات بظاہر بڑے اچھے تھے اور اہلیہ نے بھی ابتدائی عرصہ جو زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن تھا یو جھا فسانوں کے چیر پھاڑ دیکھنے کے نہائیت عمدگی اور کامیابی سے گزارا لیکن جب ان کے میکے کے رشتہ داروں کو اطلاع ہوئی تو وہ مخالف ہو گئے اور ان میں سے کوئی بھی اس کام میں ہمارا حامی نہ نکلا۔ نہ کوئی مرد، نہ کوئی عورت، آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جلسہ سالانہ کے موقعہ پر جب میں اہلیہ کو چند روز کے لیے قادیان لایا تو انہوں نے یہ فیصلہ دے دیا۔ کہ ہم کسی صورت میں بھی لڑکی کو ہسپتال نہ جانے دیں گے اور دیکھیں گے۔

کہ کس طرح لے جایا جاتا ہے۔ کس مرحلہ پر پہنچنے تک میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔
اور معاملہ ختم ہوگیا۔

اسکے بعد حضرت مرزا محمود بیگ صاحب آف پٹی ہو اس معاملہ میں
سب سے پیش پیش تھے اور جنہوں نے اپنی اہلیہ صاحبہ کو گوجرہ ضلع لائل پور
سے لاہور اس لیے بھیجا تھا کہ جا کر دیکھیں ہسپتال میں پردہ وغیرہ کا کیا انتظام ہے
اور لڑکی کو کیا کام کرنا پڑتا ہے اور انہوں نے خلاف ہی رائے دی تھی۔ فرمایا کہ
لڑکی کو کچھ دنوں کے لیے ہمارے ساتھ بھیج دو۔ جب تم مکان وغیرہ کا انتظام
کرلو گے تو لے آنا۔

چونکہ اہلیہ کے ہسپتال میں داخل ہو جانے کی وجہ سے میرا کوئی گھر
نہ رہ گیا تھا اور اپنا گھر گھاٹ دفتر کے ہی ایک کمرے میں بنا رکھا تھا۔ پھر
وہ جلسہ کے قریب کے ایام تھے ان میں کسی مکان کا بندوبست ہونا بہت مشکل
تھا اس لئے میں نے حضرت مرزا صاحب کی تجویز کو غنیمت سمجھا اور خوشی سے
اس کو قبول کر لیا۔ اہلیہ نے اشاروں اشاروں میں بتلانے کی کوشش کی کہ یہ تجویز
ٹھیک نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے لئے مزید مشکلات نہ پیدا ہوں۔ مگر میں
نے پرواہ نہ کی اور اہلیہ کے نہایت شریفانہ احتجاج کے باوجود ان کو ان کے رشتہ
داروں کے ساتھ روانہ کر دیا۔

چونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے مشکلات سے بچانا اور اپنی اہلیہ کی عقلمندی
اور دور اندیشی کا ممنون بنانا تھا اسلیئے بٹالہ پہنچ کر تجویز یہ ہوئی کہ میری اہلیہ اپنی
ہمشیرہ کے ہمراہ کاٹھ گڑھ چلی جائیں جہاں ان کے بہنوئی سب پوسٹ ماسٹر تھے اور وہ

بھی اس وقت ساتھ ہی تھے۔ حضرت مرزا صاحب بٹالہ چلے جائیں اور واپس آتے ہوئے میری اہلیہ کو کاٹھ گڑھ سے ساتھ لیکر گوجرہ سے جائیں گے۔ اس وقت تک میری اہلیہ میرے متعلق حضرت مرزا صاحب کی ناراضگی کا کھلم کھلا اظہار سُن چکی تھیں، اس لئے انہوں نے یہی غنیمت سمجھا کہ حضرت مرزا صاحب ان کو ساتھ نہیں لے گئے اور آپا کے پاس چھوڑے جا رہے ہیں۔ ادھر آپا کے پاس پہنچ کر مجھے کہا کہ ماموں جان تم سے بہت ناراض ہیں۔ بہتر ہے کہ فوراً مجھے آ کر لے جاؤ، ورنہ بات بڑھ جانے کا خطرہ ہے۔ اس پر مجھے بھی خطرہ کا احساس ہوا۔ لیکن چونکہ انہی ایام میں مجھے اخبار کے لئے جلسہ سالانہ کی روئداد مرتب کر کے دینی تھی، اس لئے باوجود کوشش کے رخصت نہ مل سکی اور اسی وجہ سے تین چار روز تک میں نہ جا سکا۔

ان ایام میں میری اہلیہ نے اپنے چچا اور بھائی کو تنگ کر دیا کہ مجھے خود چھوڑ آؤ یا گاڑی پر چڑھا دو، میں اکیلی قادیان چلی جاؤں گی، لیکن وہ حضرت مرزا صاحب کے ڈر سے نہ تو خود لے جا سکتے تھے اور نہ اکیلی لڑکی کو چڑھا سکتے تھے۔ وہ ٹال مٹول کر رہے تھے، جیسے کہ سٹیشن پر جا کر گاڑی کے نکل جانے کی وجہ بیان کر کے واپس لوٹا لاتے، کہ میں پہنچ گیا اور ساتھ لے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ چاہتے وہ بھی یہی تھے، کہ بجائے گوجرہ کی بجائے قادیان چلی جائے تا بات نہ بڑھنے پائے لیکن ماموں صاحب کے ڈر سے وہ خود بھیجنے میں حصہ نہ لے سکتے تھے بعد میں ماموں صاحب نے کسی قدر ناراضگی کا بھی اظہار کیا لیکن اسے آسانی سے رفع کر دیا گیا۔

میری اہلیہ لہنا مانی صاحبہ (اہلیہ صاحبہ حضرت مرزا محمود بیگ صاحب) کے ہمراہ بچپن میں کئی بار قادیان آچکی تھیں۔ انہوں نے ہی انکی پرورش کی تھی، کیونکہ ابھی چند ہی روز کی تھیں کہ انکی والدہ فوت ہوگئیں۔ ہمانی صاحبہ نے حقیقی والدہ کی طرح پالا پوسا اور ساری عمر اپنی اولاد کی طرح سلوک کرتی رہیں۔ آپ نہایت مخلص اور دیندار خاتون تھیں۔ حضرت مرزا صاحب جب کالج میں تعلیم پاتے تو موصوفہ ایک کافی عرصہ قادیان میں سکونت پذیر رہیں، اور ان کے اخلاص، سلیقہ شعاری اور خدمت گزاری کی وجہ سے دار مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام میں انہیں رہائش کی سعادت حاصل رہی۔ حضرت ام المومنین رضی آپ پر خاص شفقت فرماتیں۔ خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی محترم خواتین مبارکہ سے بھی آپ کو مخلصانہ محبت اور والہانہ عقیدت تھی خاص کر حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی بیگم صاحبہ آپ پر بہت مہربان تھیں اور ہمیشہ مشفقانہ سلوک فرماتیں۔

خواتینِ خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام

کی

نوازشات

اِن حالات میں میری اہلیہ صاحبہ کے لئے بھی یہ مقدس خاندان نیا نہ تھا وہ یہیں آکر ٹھیریں اور رہیں سے ان کا رخصتانہ ہوا جس کی ساری تیاری اس خاندان کی خواتین مبارکہ نے خود کی اور پھر ہر طرح حسنِ سلوک فرماتی رہیں، پھر حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ امۃ الحی صاحبہ جن کا عقد حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ سے ہو چکا تھا میری اہلیہ کی ہم عمر تھیں اور بچپن میں اکٹھی کھیلی تھیں، اس لئے ان سے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے کہ انہوں نے اتنے بلند مرتبہ پر ہونے کے باوجود میری اہلیہ سے غیر معمولی حسن سلوک روا رکھا، اور جب تک زندہ رہیں نوازشات میں اضافہ فرماتی رہیں، نہ صرف اہلیہ پر بلکہ مجھ پر بھی تھی۔ صبح سویرے دفتر آجاتا تو آپ میری اہلیہ کو اپنی خدمت میں بلا لیتیں۔ انہیں تو سیدہ امۃ الحی صاحبہ کے ہاں کھانے پینے میں کوئی تکلف نہ تھا ہی نہیں۔ ان کے ارشاد پر میرے لئے کھانا بھی بعض اوقات ان کے ہاں سے بھجوا دیتیں۔ اور ذرہ نوازی کی انتہا یہ تھی کہ بعض اوقات ہمارے ٹوٹے پھوٹے ذریعہ منا گھر میں تشریف بھی لے آتیں۔ انکی نوازشات کی ایک وجہ تو بچپن کا سہیل پن تھا لیکن حضرت خلیفۃ المسیح

الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کے حرم اوّل حضرت اُم ناصر بھی ہمیشہ میری رفیقِ زندگی
کو اپنی نوازشات سے نوازتے رہے۔ بڑی شفقت اور محبت سے پیش
آتے، اور کئی مشکلات کے وقت ہماری بڑی مدد فرمائی۔ خدا تعالیٰ انکو
اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

خاندان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دیگر خواتین
مبارکہ نے بھی ہمیشہ میری اہلیہ کو محبت اور شفقت کی نظر سے دیکھا۔ اور
جبتک میری رفیقِ زندگی کو بچوں کی پرورش کی مصروفیتوں نے معذور
نہ کر دیا ان کا زیادہ وقت خاندان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام
میں ہی گزرتا۔ اگر کسی دن نہ جا سکتیں تو وجہ دریافت کرنے اور بلانے کے
لئے خادمائیں بھیجی جاتیں، اور اس طرح میرے اخبار نویسی کے کام میں بہت
سہولت اور آسانی پیدا ہوئی۔ بیوی کے ذریعہ نہ صرف خاندان حضرت
مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق ضروری اطلاعات صحیح طور پر پہنچ جاتیں۔
اور میں انہیں اخبار میں جلد سے جلد شائع کر سکتا بلکہ سلسلہ کے متعلق کوئی اہم
مضمون لکھنے اور اس کی اشاعت کی منظوری حاصل کرنے میں بھی بڑی سہولت
حاصل ہو سکتی۔ میں ان کے ذریعہ حضور کی خدمت میں بھجوا دیتا اور وہ واپس
کرا کے لے آتیں۔

الفضل کی ایڈیٹری

ان ایام میں جبکہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالےٰ کی راہ نمائی میں مضمون نویسی کی مشق کر رہا تھا اور مبلغین کلاس میں پڑھتا تھا "الفضل" کی ایڈیٹری پر کوئی صاحب مستقل طور پر مقرر نہ تھے۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ جو الفضل کے بانی اور ایڈیٹر تھے منصب خلافت پر متمکن ہو چکے تھے، آپ کے بعد الفضل پر بطور ایڈیٹر حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا نام لکھا جانے لگا۔ مگر آپکی بھی مصروفیات اس قدر وسیع اور اتنی توجہ طلب تھیں کہ آپ الفضل کے لئے مستقل طور پر وقت نہ نکال سکتے تھے، اور عملی طور پر قاضی اکمل صاحب ایڈیٹر تھے مگر ان کے سپرد بھی اور کئی کام تھے، اس لئے کسی مستقل ایڈیٹر کی تلاش تھی حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ الفضل کا سارا بوجھ خود ہی برداشت کرتے تھے جو الفضل کے ہفتہ میں دو بار بلکہ سہ بار نکلنے کی وجہ سے بہت بڑھ گیا تھا اور الفضل کی انتظامی امور میں بھی حضور راہ نمائی فرماتے تھے۔

ایک دن آپ نے مجھے فرمایا۔ ماسٹر احمد حسین صاحب[1] فرید آبادی کو جو دہلی میں رہتے ہیں خط لکھدو کہ اگر الفضل کی ایڈیٹری کے لئے ۴۵ روپیہ پہ آسکیں تو آجائیں۔ میں نے لکھا اور وہ آگئے۔ اور الفضل میں بطور

[1] والد ماجد ڈاکٹر محمد احمد صاحب فرید آبادی ربوہ

ایڈیٹر کام کرنے لگ گئے۔

ماسٹر صاحب موصوف پرانے احمدی تھے، کئی اخبارات اور وکیل امرتسر میں کام کر چکے تھے۔ پیغام صلح اخبار جب لاہور سے جاری ہوا تو اس کے پہلے ایڈیٹر آپ ہی مقرر ہوئے۔ لیکن پیغام صلح کے ڈائریکٹرز جس راستہ پر چلانا چاہتے تھے اس پر چلنا انہوں نے پسند نہ کیا اور کچھ عرصہ کے بعد استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ دہلی میں اس وقت کتابوں کی دکان کرتے تھے۔

ماسٹر صاحب آ تو گئے لیکن کمزور اور ضعیف ہو چکے تھے، ساتھ ہی عمر بھی کافی ہو چکی تھی، اس لئے خلافت ثانیہ کے ابتدا میں ایڈیٹر کو جس قدر دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی اسے برداشت نہ کر سکے اور چند ہی ماہ بعد انہیں فارغ کر دیا۔ وہ پھر یہیں کے ہو رہے۔ چھوٹی سی کتابوں کی دکان کھولی۔ چند چھوٹی موٹی کتابیں بھی عورتوں کے متعلق تصنیف کیں مگر دکان نہ چلی اور کچھ عرصہ کے بعد قادیان میں [illegible] پا کر دنیا کے دھندوں سے چھوٹ گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

ماسٹر صاحب کے ایڈیٹری کے فرائض سے فارغ ہونے پر ایڈیٹری کی ذمہ داری پھر قاضی اکمل صاحب پر آ پڑی۔ جو ہم چند نو آموز نوجوانوں کی رفاقت سے کام چلاتے۔ اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ قاضی صاحب کچھ نہ لکھا کریں صرف دوسرے کام کرنے والوں کی نگرانی کیا کریں اور سارا کام ان سے کرائیں۔

واقعہ یہ ہوا کہ ان دنوں مولوی محمد احسن صاحب امروہوی ڈانواں ڈول ہو رہے تھے، ان کے بیٹے یعقوب کی جس کے ہاتھ میں بوجہ ارذل العمر اور بیمار ہونے کے انکی باگ تھی۔ کوشش یہ تھی کہ مولوی صاحب کی جہاں سے زیادہ قیمت وصول ہو سکے ادھر انہیں دھکیل دے یا پھر بیچ میں رکھ کر دونوں طرف سے فوائد حاصل کرے۔ اسی دوران میں مولوی صاحب قادیان آئے۔ تو قاضی صاحب نے مدینۃ المسیح میں انکی آمد کا ذکر کچھ جچتے ہوئے الفاظ میں کیا۔ اخبار ڈاکخانہ میں بھیجنے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب کی نظر سے گزرا جو اس وقت دفتر الفضل میں اتفاقیہ تشریف لائے تھے، اور آپ نے اس موقعہ پر اس قسم کے الفاظ نامناسب قرار دیئے اور اس کا ذکر اسی وقت حضرت صاحب سے جا کر کیا۔ حضور نے مجھے بلا کر فرمایا۔ یہ پرچہ ڈاک میں نہ ڈالا جائے بلکہ تلف کر دیا جائے۔ اور قاضی صاحب سے کہہ دو کہ اخبار میں یہ کچھ نہ لکھا کریں۔

اس کے چند روز بعد ایسا اتفاق ہوا کہ پریس بند ہو گیا، اور اخبار کی اشاعت رک گئی۔ پریس کے مینجر بھی قاضی صاحب تھے۔ چند دن اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن مسجد مبارک میں ظہر کی نماز کے بعد حضور نے نشست فرمائی۔ تو کسی صاحب نے عرض کیا:۔

"حضور الفضل کیوں بند ہو گیا ہے۔ کئی دن سے شائع نہیں ہوا"

حضور نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

"میں نے سمجھا تھا مجھے نہیں مل رہا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ شائع ہی نہیں ہو رہا۔ اور فرمایا۔ "کوئی الفضل کا آدمی ہے؟ میں نے اپنے آپ کو

پیش کیا، تو پوچھا۔ اخبار کیوں شائع نہیں ہو رہا؟ میں نے عرض کیا۔ حضور مجھے وجہ تو معلوم نہیں، قاضی صاحب کو معلوم ہوگی۔ فرمایا۔ جاؤ اور ان سے پوچھ کر بتاؤ۔

میں گیا اور سارا واقعہ قاضی صاحب سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا۔ وجہ یہ ہے کہ آجکل فصل کی کٹائی کے دن ہیں، اس لئے باوجود کوشش کے پریس کی مشین چلانے والے آدمی نہیں ملتے۔ ایک دو روز تک امید ہے انتظام ہو جائے گا۔ اس وقت پریس کی مشین انجن سے نہیں چلتی تھی بلکہ آدمی چلاتے تھے۔

میں نے آکر حضور سے یہ بات عرض کر دی۔ حضور نے فرمایا:۔

"آج سے تم اخبار چلانے کا خود انتظام کرو۔ جو کچھ خود لکھ سکتے ہو لکھو دوسرے ساتھیوں سے لکھواؤ، مجھ سے بھی مضمون لے لیا کرو، اور کل اخبار ضرور نکل جائے، خواہ ایک ورق کا ہی نکلے۔"

میں نے جا کر قاضی صاحب سے ذکر کیا۔ اس کے بعد ایک پرچہ انہوں نے ایڈٹ کیا اور پھر یہ ذمہ داری مجھ پر رکھ دی گئی

جناب قاضی صاحب نے اپنی ادارت کے آخری پرچہ میں ایک چھوٹا سا نوٹ لکھ دیا جس کے الفاظ قریباً یہ تھے:۔

"میں اس پرچہ سے الفضل کے متعلق اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ آئندہ اخبار بھی مقدس ہاتھوں میں جا رہا ہے، امید ہے کہ احباب کے لئے زیادہ دلچسپی کا سامان مہیا کرے گا۔"

خدا تعالیٰ کی شان یہ نوٹ میرے لئے ہمیشہ ہی مفید اور کار آمد ثابت ہوا۔

اس وقت اخبار پر بطور ایڈیٹر کسی کا نام لکھا جاتا تھا۔ (کیونکہ اس زمانہ میں سرکاری طور پر اس کی پابندی نہ تھی اور کوئی مستقل ایڈیٹر نہ ہونے کی وجہ سے بار بار کی تبدیلی کا اظہار مناسب نہ تھا) احباب جماعت نے یہ سمجھا کہ اب سلسلہ کے کوئی بزرگ اس کام پر مقرر ہوئے ہیں۔ مقامی طور پر بھی کسی کو یہ خیال نہ آسکتا تھا کہ میرے سپرد یہ کام ہوا ہے اور میں اسے چلا سکتا ہوں۔ میں نے خود بھی اپنی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ کسی پر یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ ذمہ داری مجھ پر رکھی گئی ہے۔ اُدھر خدا تعالیٰ نے کچھ ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ اخبار کے لئے اعلیٰ پایہ کے مضمون مہیا ہونے لگے، حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنفس نفیس خود بعض اوقات مضمون رقم فرما کر عنایت کرتے۔

حضرت مولوی محمد اسمٰعیل صاحب فاضل کو ارشاد فرمایا کہ وہ ہر پرچہ کے لئے مضمون لکھ کر دیا کریں۔ مکرم محترم مولوی فضل الدین صاحب وکیل کو ایک خاص سلسلہ مضامین رقم کرنے کا ارشاد فرمایا، جو مولوی محمد احسن صاحب امروہی کی خلافت سے برگشتگی کے متعلق تھا۔ اس کے علاوہ وہ مجھے مضامین لکھنے اور میرے مضامین کی اصلاح کرنے اور ضروری معلومات مہیا کر کے دینے میں بھی بہت مدد فرمانے لگے۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی بہت کار آمد ثابت ہوئی کہ کوئی مضمون لکھنے سے پہلے اس کے متعلق ضروری معلومات علماء سے پوچھ لو۔

مہیا کر لیا کروں ۔ اور یہ خدا تعالیٰ کا فضل تھا کہ جس کسی بھی میں نے کچھ پوچھا انہوں نے بڑی محبت اور خوشی سے میری امداد فرمائی ۔ اس طرح مضمون لکھنے اور بزرگوں سے مدد حاصل کرنے میں میں نے دن رات ایک کر دیا ۔ اور کئی کئی پرچوں کے مضامین پہلے سے مہیا کر رکھتا ۔ اسطرح اخبار میں ایک شان پیدا ہو گئی ، اور مقبولیت بڑھنے لگی ۔

انہی ایّام کا ایک لطیفہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ کچھ دنوں تک تو حضرت مولوی محمد اسمٰعیل صاحب فاضل باقاعدہ طور پر اخبار کے لئے مضمون دیتے رہے ، مگر ان کے سپرد اور بھی کئی کام تھے ۔ مدرسہ احمدیہ میں پڑھاتے بھی تھے ۔ علاوہ ازیں بہت سوچ کر لکھتے اور کانٹ چھانٹ بہت کرتے ، اس وجہ سے ان کا مضمون حاصل کرنے پر دقت پیش آتی اور اخبار وقت پر تیار کرنا مشکل ہو جاتا ۔ کیونکہ وہ افتتاحیہ لکھ دیا کرتے تھے ۔ ایک دن جب میں اس مشکل میں مبتلا تھا میں نے ان سے مضمون حاصل کرنے کی یہ تجویز کی کہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کے نام میں نے رقعہ لکھا جس میں گزارش کی کہ مولوی صاحب سے بروقت مضمون نہ ملنے کی وجہ سے سخت دِقت پیش آتی ہے ۔ حضور کوئی اور انتظام فرمائیں ۔ اس سے غرض میری یہ تھی کہ میں رقعہ مولوی صاحب کو دکھاؤں گا اور اس طرح ان سے مضمون حاصل کر لوں گا ۔ حضرت اقدس کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ نہ تھا ۔ چنانچہ جب میں نے مولوی صاحب کو یہ رقعہ دکھایا تو انہوں نے مجھ سے یہ کہہ کر لے لیا کہ حضور کو نہ دو میں ابھی مضمون بھیجتا ہوں اور رقعہ اپنے کاغذات میں رکھ لیا ۔ مضمون تو تھوڑی دیر کے بعد مجھے پہنچ گیا لیکن حضرت

امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ میرا رقعہ بھی میرے پاس واپس آگیا۔ جو مولوی صاحب نے مجھ سے لے کر رکھ لیا تھا۔ اور اس پر حضور نے لکھا تھا۔

"مولوی صاحب سے مضمون نہ مانگا کرو۔ میں اور انتظام کر رہا ہوں۔"

اس رقعہ کو دیکھکر میں حیران رہ گیا اور مولوی صاحب کے پاس پہنچ کر جب ان کو وہ رقعہ دکھایا تو وہ بھی سخت پریشان ہو گئے کہ حضور کے پاس رقعہ کس طرح چلا گیا۔ بات یہ ہوئی کہ حضرت مولوی صاحب ان دنوں حضور کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔ حضور کی خدمت میں انہوں نے اس دن جو ضروری کاغذات بھیجے ان میں غلطی سے وہ رقعہ بھی بھیج دیا۔ حضور بھی ان کی مصروفیات کو جانتے تھے۔ الفضل کے لئے باقاعدہ مضامین نویسی سے انہیں چھٹی دے دی۔

جناب ماسٹر احمد حسین صاحب فرید آبادی مرحوم جتنا عرصہ الفضل میں رہے مجھے ان سے بھی زباندانی کے متعلق اصلاح لینے کا موقعہ ملا۔ اور میں نے فائدہ اٹھایا۔ ایڈیٹری کی ذمہ داری اٹھانے سے قبل مجھے مضمون نویسی کی ایک حد تک مہارت ہو چکی تھی جس میں مجھے سب سے زیادہ فائدہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کا درس القرآن، خطبات اور تقریریں مرتب کرنے سے ہوا۔ نیز حضور کے مضمون لکھنے کے لئے نوٹ لکھانے سے بھی۔ کیونکہ ان کو مرتب کرتے ہوئے مضمون نویسی کی کافی مشق ہوتی تھی۔ تاہم مقررہ وقت پر مضمون مرتب کر کے اخبار مکمل کرنا اور وقت پر شائع کرنا بہت اہم کام تھا۔ مگر خدا تعالیٰ نے اس کے لئے بہت سی آسانیاں مہیا فرما دیں، جن کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں۔

اور میں محض خدا تعالیٰ کے فضل اور حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی ذرہ نوازی سے چل نکلا۔ ان دنوں میرا معمول تھا کہ اخبار تیار ہونے پر ظہر یا عصر کی نماز کے بعد جب حضور مسجد میں مجلس فرماتے، اس وقت خود پیش کرتا۔ حضور اسی وقت سرسری ملاحظہ فرماتے اور جو بات قابلِ اصلاح ہوتی وہ ارشاد فرما دیتے۔ میں اسے نوٹ کر لیتا اور اس پر بڑی احتیاط سے عمل کرتا۔ ایک لمبے عرصہ تک یہی معمول رہا۔ میں نے اخبار کا چارج لینے کے بعد اس میں چند اضافے کئے اور خدا تعالیٰ کے فضل سے مقبول ہوئے اور جب تک میں اخبار میں رہا وہ جاری رہے۔ مثلاً اخبار احمدیہ کا عنوان قائم کیا جس میں احباب جماعت کی چھوٹی چھوٹی باتیں درج کی جاتیں، ولادت اور اموات کے اندراج کا انتظام کیا گیا تاکہ اس لحاظ سے بھی جماعت کی ترقی کا اندازہ ہوتا رہے۔ درخواست ہائے دعا کی اشاعت کو رواج دیا گیا۔ اس سے احباب کی عام حالت کا پتہ لگتا، ایک دوسرے سے ہمدردی کرنے کا موقعہ ملتا۔ اعلانات نکاح کئے جاتے۔ بغرضیکہ یہ کالم بہت مفید اور دلچسپ ثابت ہوا۔

۲۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کے خطباتِ جمعہ، خطباتِ نکاح اور دوسری تقریروں کو عنوان مقرر کر کے شائع کرنے کو رواج دیا گیا۔ جس سے اصل موضوع کا پتہ چلتا ہے۔

۳۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ جب کبھی سفر پر تشریف لے جاتے تو سفر کے حالات، تقاریر، خطبے اور مختلف احمدی غیر احمدی اور

غیر مسلم احباب سے گفتگوئیں مرتب کر کے شائع کی جائیں۔

الفضل کی اشاعت میں تبدیلی

میں نے جب چارج لیا تو اخبار ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا پھر مستقل تین بار چھپنے لگا اور پھر روزانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ بطور مددگار کئی اصحاب نے کام کیا مگر کوئی نہ کوئی وجہ ان کے ادل بدل کی پیدا ہو جاتی رہی، البتہ خدا تعالیٰ نے مجھے ۳۳-۳۴ سال الفضل کی خدمت کرنے کا موقعہ عطا فرمایا۔ الحمد للہ! بیشک الفضل کے اخراجات حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے عطا فرماتے رہے عہدہ کی تعیین کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ لیکن جب حضور نے الفضل صدر انجمن احمدیہ کو عطا کر دیا اور الفضل کے کارکن بھی انجمن کے کارکن قرار پائے تو عہدے بھی تجویز ہوئے، اور کاغذات میں میرا عہدہ اسسٹنٹ ایڈیٹر رکھا گیا۔ اس وقت میں کام ایڈیٹر کا کرتا تھا اور کرتا رہا۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ کب اور کس طرح "اسسٹنٹ" کا لفظ اڑ گیا۔ نہ میں نے اس کے لئے کبھی درخواست دی نہ کوشش کی اور نہ اس تبدیلی کے معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

ابتدا میں جب میں نے الفضل میں کام شروع کیا، غالباً ۱۲ روپے میری تنخواہ مقرر کی گئی۔ جب شادی ہو گئی تو ۱۸ روپے حضور نے کر دی۔ یہی تنخواہ اس وقت تھی جب مجھے ایڈیٹر کا کام عطا کیا گیا اور قریباً سال بھر یہی تنخواہ رہی۔ پھر حضور نے ۲۵ روپے کر دی اور کافی عرصہ تک یہی رہی ہم میاں بیوی دو

گئے تھے۔ اس تنخواہ میں اچھی گزر ہو جاتی۔ اور جب خدا تعالیٰ نے اولاد
دینی شروع کی تو تنخواہ بھی بڑھنے لگی اور آخر وقت سو روپے تک پہنچی۔ سولہ
روپے گرانی الاؤنس ملتا تھا۔ ۳۳-۳۴ سال کے بعد اخبار کے کام سے فارغ
ہونے پر قواعد کی رو سے ۵۰ روپے پوری پنشن ملی۔

صحت

یہ خدا تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ میری صحت بہت اچھی تھی اور
الفضل میں صدی کے تیسرے حصہ سے زیادہ عرصہ تک خدمت کرنے کے
دوران میں عموماً اچھی رہی۔ الحمدللہ!

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور نہایت خطرناک
حد تک پہنچ گئی۔ گھر گھر کئی کئی بیمار پڑے تھے، ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ انہی ایام میں
مجھے بھی ایک دن ہلکا سا بخار ہو گیا۔ گھر میں میں، اہلیہ اور ضعیف العمر والد
صاحب تھے۔ اہلیہ بہت گھبرا گئی۔ حضور کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوئی۔
حضور نے دعا فرمائی۔ تسلی دی، پھر سیب عنایت کئے اور ہدایت فرمائی کہ
چھیل کر دینا۔ چھلکے سمیت نہ کھلانا۔ دوا بھی بھجوائی۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے
دوسرے دن بخار اتر گیا اور پھر یہ ایام کرب و بلا خیریت سے گزر گئے۔

الفضل میں کام کرنے کے سالہا سال عرصہ میں صرف ایک لمبی تکلیف
کا سامنا ہوا اور وہ دائیں پاؤں کے گھٹنے کے قریب معمولی پھنسی نکلنے کی وجہ
سے شروع ہوئی۔ اس مقام پر پھنسی نکلتی جو زخم اختیار کر لیتی۔ اس میں نہ

پیپ پڑتی اور درد اُٹھتا۔ علاج کرنے سے وہ اچھی ہو جاتی تو ایک کے قریب ہی دوسری نکل آتی۔ اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ مجھے کوئی خاص تکلیف تو نہ تھی، البتہ چلنے پھرنے میں دقت ہوتی۔ ابتدا میں تو میں اسی حالت میں دفتر جاتا رہا اور کام کرتا رہا۔ لیکن جب یہ سلسلہ لمبا ہو گیا تو میں حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ سے مشورہ لے کر حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب کے پاس علاج کے لئے لائلپور چلا گیا۔ اُن دنوں آپ لائلپور کے سول ہسپتال میں متعین تھے۔ آپ نے مجھ پر بیحد شفقت اور نوازش فرمائی اور قریباً ایک ماہ تک پوری توجہ سے علاج کرنے کے علاوہ کھانا بھی اپنے ہاں سے کھلاتے رہے۔ آپ نے انڈر کلوروفارم زخم کی جگہ کا اپریشن کیا۔ اور ارد گرد سے کافی گہرا کاٹ دیا۔ اور جب زخم مل گیا تو مجھے قادیان آنے کی اجازت دی۔ لیکن قادیان آکر پھر ویسی ہی پھنسی نکل آئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ چند ہی روز بعد حضرت میر صاحب بھی لمبی رخصت لیکر قادیان تشریف لے آئے۔ میں نے انہیں حالت بتائی تو آپ نے دوبارہ اپریشن تجویز فرمایا اور قادیان کے نور ہسپتال میں عمدہ اپریشن بھی کر دیا۔ جو پہلے سے بڑا تھا۔ چونکہ نور ہسپتال میں ضروری سامانِ اپریشن کی کمی تھی، اوزار بھی مکمل اور اعلیٰ درجہ کے نہ تھے اس لئے اس اپریشن میں مجھے بہت تکلیف ہوئی جس کے لئے میں دوبارہ خوشی سے اس لئے فوراً تیار ہو گیا تھا کہ لائلپور میں جو آپ نے اپریشن کیا تھا اس میں مجھے بہت کم تکلیف ہوئی تھی۔ یہاں اول تو کلوروفارم سونگھتے ہوئے بے ہوشی طاری ہونے تک بہت تکلیف ہوئی اور اس میں بہت دیر لگی۔

بلکہ لائلپور میں گنتی کرتے ہوئے میں چار سے آگے نہ بڑھ سکا تھا اور فوراً بیہوش ہوگیا تھا۔ دوسرے اپریشن کے بعد کافی درد ہونے لگا اور رات بڑی تکلیف سے گزاری۔ اس کے بعد دوسرے دن کی صبح تک ہماری ٹانگ سوج کر کپا بن گئی۔ اس پر میں نے حضرت میر صاحب کو صبح ہی صبح رقعہ لکھا کہ اگر آپکو فرصت ہو اور تشریف لا سکیں تو چند منٹ کے لئے کسی وقت تشریف لاکر مجھے دیکھ جائیں۔ تکلیف زیادہ ہے۔

آپ نے اس رقعہ پر اپنے پُر مذاق انداز میں لکھ کر مجھے بھیج دیا

"جناب عالی! حکم حضور سے اطلاع پائی۔ میں فوراً حاضر ہو رہا ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد خود تشریف لے آئے۔ سردی کا موسم تھا۔ باہر نکلنے کے گرم کپڑے پہننے میں جتنی دیر لگ سکتی ہے غالباً اتنی ہی لگی۔ آکر مسکراتے ہوئے فرمایا:۔

" لائلپور اور قادیان کے ہسپتالوں کا فرق محسوس ہوا یا نہیں، اگر کچھ دن اور وہاں ٹھیر جاتے تو اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔

پھر ہر طرح تسلی دی۔ زخم دیکھا اور خود ڈریسنگ کیا۔ اس زخم کے اچھا ہونے میں کافی عرصہ لگا اور کافی عرصہ تک ہسپتال میں پڑا رہا۔ جب اس دفعہ بھی زخم مندمل ہونے کے قریب ہوا تو پھر نئی پھنسی نمودار ہوگئی۔ آخر حضرت میر صاحب نے ٹیکہ تجویز فرمایا اور اس سے خدا تعالیٰ نے قریباً آٹھ نو ماہ بعد صحت عطا کی اور میں دفتر میں آکر کام کرنے کے قابل ہو سکا۔

مکمل طور پر صحت یاب ہونے سے کچھ روز قبل حضرت مولوی شیر علی صاحب غریب خانہ پر برائے عیادت تشریف لائے اور اپنا رؤیا سنایا کہ "میں نے دیکھا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالےٰ نے چند اصحاب کو ایک دعوت میں مدعو فرمایا ہے جس میں میں بھی شریک تھا اور میں نے اس دعوت میں تم کو بھی دیکھا اور تندرست حالت میں، دیکھ کر میں نے تم سے خیریت دریافت کی۔ میں نے عرض کیا۔ خدا تعالیٰ صحت عطا کر رہا ہے۔ دعا کریں یہ تکلیف پھر عود نہ کر آئے۔"

تھوڑا ہی عرصہ بعد جب میرا پاؤں کچھ بوجھ سہارنے کے قابل ہوگیا تو میں نے تانگہ پر دفتر آنا اور کام کرنا شروع کر دیا، اور جب چند دن بعد میں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی طاقت محسوس کی، تو ایک دن جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد اقصیٰ میں بھی پہنچ گیا اور قطار میں کھڑے ہو کر حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کا شرف حاصل کیا حضور نے مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا۔ "کئی دن ہوئے میں نے تمہیں رؤیا میں دفتر میں بیٹھے کام کرتے دیکھا۔" میں نے عرض کیا، واقعی میں کئی دن سے دفتر میں کام کرنے کے لئے آرہا ہوں۔ اسکے بعد پاؤں ٹھیک ہوگیا اور پھر اس بیماری نے کبھی حملہ نہ کیا۔ الحمد للہ!

موٹر کا حادثہ

حضرت میر صاحب کے پاس جب میں لائلپور گیا تو میرا خیال تھا کہ دوسرے یا تیسرے دن میرا اپریشن ہو جائیگا لیکن حضرت میر صاحب نے ہفتہ عشرہ تک اپریشن نہ کیا۔ یوں وہ تین دفعہ روزانہ میرے پاس تشریف لاتے کافی دیر تک تشریف رکھتے، نہایت دلچسپ اور روحانیت سے پُر گفتگو فرماتے، لیکن میری پھنسی کے متعلق کچھ نہ فرماتے۔ اگر میں خود پوچھتا تو بھی ٹال جاتے۔ اسی دوران میں ایک دن آپکو شہادت کے لئے عدالت میں جانا پڑا۔ چونکہ کار پر جا رہے تھے اس لئے مجھے بھی فرمایا چلو تم بھی سیر کر آؤ۔ میں آپ کے ساتھ ہو گیا۔ واپسی پر جب کار شہر کے قریب پل پر سے گزر رہی تھی تو اچانک ایک بیل گاڑی سامنے آ گئی۔ ڈرائیور نے کار ایک پہلو کی طرف موڑ کر نکالنے کی کوشش کی تو کار پل کی بلندی سے پہلو کی نیچائی کی طرف لڑھک گئی۔ مگر خدا تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ اُلٹی نہیں بلکہ سیدھی نیچے پہنچ گئی۔ یہ حادثہ آناً فاناً ہوا اور الحمد للہ کہ بالکل خیریت رہی۔ پاس ہی کالج تھا۔ طلباء ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ بہت سے لڑکے فوراً پہنچ گئے اور کار کو دھکیل کر سڑک پر لے آئے۔ حضرت میر صاحب نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور مذاقیہ رنگ میں فرمایا۔ کہ دو خطرناک حادثے پیش آیا۔ مگر خدا تعالیٰ کے فضل سے ہم بال بال بچ گئے!

لائل پور کے ہسپتال میں میں تقریباً ایک ماہ رہا۔ حضرت میر صاحب روز میرے پاس تشریف لاتے۔ اور چھٹی کے دن تو کافی دیر تک میرے پاس تشریف رکھتے۔ زخم کے متعلق میں پوچھتا کہ کب تک اچھا ہو گا تو خوش طبعی میں ٹال دیتے۔ میں کہتا، میری رخصت ختم ہونے والی ہے، تو فرماتے اس کا فکر نہ کرو، رخصت جتنی چاہو میں منظور کرا دونگا اور فرماتے، یوں تو تم نے کبھی رخصت نہیں لی، اس بہانے سہی رخصت مل رہی ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ ان کے دوسرے بیمار یا متعلقین مجھ پر آپ کی نوازشات دیکھ کر کہتے کہ ہمیں جانے کی اجازت لے دو یا اس قسم کا کوئی اور چھوٹا موٹا کام کرا دو، تو میں کہتا کہ اس قسم کی کوئی بات میں اپنے متعلق نہیں منوا سکتا، تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔

ایک دن ایک ہندو نوجوان جس نے افیم کھالی تھی رات کو ہسپتال میں لایا گیا۔ حضرت میر صاحب نے قے کے ذریعہ اس کی افیم نکالی۔ صبح تک وہ چنگا بھلا ہو گیا۔ ادھر پولیس اس کی گرفتاری کے لئے آ پہنچی۔ اسکے متعلقین بڑی دوڑ دھوپ کر رہے تھے کہ پولیس کی گرفت سے بچ جائے۔ اس سلسلہ میں جب ان کی گفتگو میں یہ ذکر آیا کہ ڈاکٹری رپورٹ اپنے حق میں کرانے کے لئے جو کچھ بھی خرچ کرنا پڑے کر دینا چاہیئے۔ یہ گفتگو میرے بیڈ کے قریب ہو رہی تھی اور میں نے سُنا انہی میں سے ایک نے کہا۔ ڈاکٹر احمدی ہے، اس کے متعلق یہ خیال بھی نہ کرو۔ وہ وہی کرے گا جو اس کی سمجھ میں آئے گا۔ ہاں اس کے دل میں رحم آجائے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔

آخر پولیس تو ناکام چلی گئی۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نوجوان حضرت میر صاحب کی مہربانی سے گرفتاری سے بچ گیا۔

حضرت میر صاحب جب گوجرانوالہ میں بطور سول سرجن متعین تھے تو وہاں مجھے اہلیہ سمیت والدہ ماجدہ کی آنکھوں کا اپریشن کرانے کے لئے جانا پڑا۔ اہلیہ اپنے ساتھ کچھ پھل لے گئیں۔ جب ہم کوٹھی پر پہنچے تو باوجود اس کے کہ حضرت میر صاحب کی ملازمہ ہماری ایک واقف تھی قادیان میں ہمارے محلہ اور ہمسایہ کی رہنے والی تھی مگر اس نے پھل کی ٹوکری اٹھا کر اندر لے جانے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا میر صاحب کی اجازت نہیں ہے۔ اتفاق سے اس وقت حضرت میر صاحب گھر میں نہ تھے۔ میری اہلیہ اندر چلی گئی اور ٹوکری باہر ہی رہ گئی۔ حضرت میر صاحب تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ یہ ٹوکری اندر لے جانے کی اجازت فرمائی جائے۔ آپ نے مسکراتے ہوئے ملازمہ سے فرمایا۔ اس کے لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ تو ہمارے ایڈیٹر صاحب کی طرف سے تحفہ ہے، تب اس نے ٹوکری کو ہاتھ لگایا۔

دوسرے دن کوٹھی کے باہر میں نے دیکھا کہ ایک ہندو دکاندار سٹیشنری کی چیزیں لئے بیٹھا ہے اور حضرت میر صاحب کے بچے ضرورت کی چیزیں اپنے اپنے لئے پسند کر رہے ہیں۔ جب بچے چیزیں پسند کر چکے تو حضرت میر صاحب کے ملازم نے قیمت پوچھی تو دکاندار نے کچھ اس قسم کی گفتگو کی کہ گویا وہ قیمت نہیں لینا چاہتا۔ یونہی پیش کرنا چاہتا ہے۔ ملازم

نے میر صاحب سے عرض کیا کہ وہ قیمت نہیں بتاتا۔ حضرت میر صاحب خود تشریف لائے اور دکاندار سے کہا، اِن چیزوں کی قیمت بتاؤ۔ اُسنے پہلے سے بھی زیادہ لجاجت سے گفتگو شروع کی۔ تو آپ نے بچوں سے فرمایا۔ ساری چیزیں رکھ دو اور دکاندار سے کہا کہ تم اپنی چیزیں سمیٹ کر چلے جاؤ۔ اُسنے بڑی منت سماجت سے کہا۔ حضور میں ایک ایک چیز کی قیمت بتاتا ہوں، مجھ سے غلطی ہو گئی مجھے معاف کر دیں۔ مگر آپ نے ایک نہ سنی اور کوٹھی سے نکلوا دیا۔

حضرت میر صاحب کے ذکرِ خیر میں ایک اور بات بھی قابلِ بیان ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ پنشن پر قادیان آ چکے تھے، ایک دن میں نے عرض کیا کہ مجھ کو پسلیوں کی درد کی تکلیف رہتی جا رہی ہے، کوئی علاج بتائیں۔ آپ نے فرمایا اس کا ایک آسان علاج ہے کہ تمباکو پینا شروع کر دو۔ میں نے سمجھا مذاق کر رہے ہیں اور کہا مجھے یہ نسخہ لکھ دیں۔

فرمایا۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں، لکھ کر دینا تو الگ، رہا اگر تم پکڑے گئے تو میں تمہارے حق میں شہادت نہ دوں گا اور کہہ دوں گا کہ میں نے اس طریقے سے تمباکو پینے کے لئے نہ کہا تھا۔ تم تمباکو پیو مگر ان پابندیوں کے ساتھ جو نظامِ سلسلہ نے مقرر کر رکھی ہیں اور وہ یہ کہ تمہیں، عمر ۴۰ سال سے اوپر ہو۔ کھلم کھلا دوسروں کے سامنے نہ پیا جائے۔ گھر میں بچوں سے بھی پوشیدہ پیا جائے، اور ان سے تمباکو پینے کے متعلق کوئی کام نہ کرایا جائے۔

غرض لتفصیل میں سالہا سال تک کام کرنے کے دوران میں اس لمبی بیماری کے سوا مجھے کوئی بیماری لاحق نہ ہوئی اور پورے اطمینان سے کام کرسکا۔ البتہ آخری سالوں میں مجھے گھٹنوں میں معمولی درد ہوگیا اور دایاں پہلو کندھے سے لیکر پنڈلی تک اور دایاں بازو کچھ اس قسم کی کمزوری محسوس کرنے لگا کہ میرا اس پہلو سونا مشکل ہوگیا۔ اور یہ تکلیف اب تک موجود ہے۔ حضرت میر صاحب نے اس کے متعلق مجھے مشورہ دیا کہ میں دائیں ہاتھ سے لکھنا چھوڑ دوں اور بائیں ہاتھ سے لکھنا سیکھ لوں، یا خود بولتا جاؤں اور دوسرے آدمی سے لکھوایا کروں۔

اول الذکر تجویز پر تو میں عمل نہ کرسکا البتہ مؤخر الذکر سے کسی قدر کام لیتا رہا۔ اور آخری چند سال خود مضمون لکھنے کی بجائے دوسرے کو لکھاتا رہا۔ گھٹنوں کی تکلیف کے علاج کے طور پر حضرت میر صاحب نے یہ بتایا کہ کسی قدرتی گرم چشمہ میں نہاؤں۔ مگر کئی سال تک اس کے لئے کوئی صورت نہ پیدا ہوئی تا آنکہ ۱۹۴۶ء کے آخر میں جب میں کئی ماہ کی رخصت پر تھا اپنی بچی کیشر احمد کو پہنچانے کے لئے مونگھیر صوبہ بہار میں گیا جہاں اس کا میاں عبد الحمید ملٹری کی ملازمت کے سلسلہ میں سکونت پذیر تھا۔ وہاں میں دسمبر ۱۹۴۶ء کے آخر میں پہنچا اور جاتے ہی معلوم ہوا کہ یہاں سے قریب ہی قدرتی گرم چشمے موجود ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام کرشن کنڈ ہے جو ہندوؤں کا تیرتھ ہے اور دوسرا مسلمانوں کے ایک گاؤں "بروہ" کے قریب ہے اور اس پر مسلمانوں کا تصرف ہے۔ یہ سارا گاؤں مسلمانوں کا تھا

اچھی خوبصورت مسجد اور ایک پہاڑی پر عمدہ عید گاہ بنی ہوئی تھی نوجوان اچھے صحت مند اور بہت سے پہلوان تھے۔ باقاعدہ اکھاڑہ تھا جہاں ورزش کی جاتی تھی۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں بہار میں مسلمانوں کا ہندوؤں نے جو قتل عام کیا اس کی دست برد سے یہ قصبہ بچ گیا تھا۔ اس کے اردگرد مسلح ہندوؤں کے اجتماع ہوتے رہے لیکن مسلمانوں کی جوابی طاقت اور بروقت پہنچنے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔

ہندوؤں کا مقدس چشمہ تو اپنی عجوبہ پرستی کی وجہ سے مشہور اور بہت تیرتھ بنا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد کچھ عمارتیں پرانے وقتوں کی موجود تھیں اور اس کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ یہاں کرشن جی کی رانی سیتا جی آتی ہوتی تھیں اور اس وجہ سے گرم پانی ابلنے لگ گیا تھا اور اب تک جاری ہے۔ اور ایک پختہ نالی میں سے بہہ کر چھوٹی سی جھیل میں جا گرتا تھا۔ مسلمانوں کے قصبہ میں جو چشمہ تھا اور گاؤں کے بالکل قریب تھا۔ وہ ایک اونچی چار دیواری سے محصور تھا۔ اس کا پانی بھی نکل کر پختہ نالی میں بہتا تھا اور مسلمان مرد عورتیں اس نالی پر بیٹھ کر نہاتے اور کپڑے دھوتے۔ نالی اور چشمہ کی چار دیواری تھوڑے ہی عرصہ کی تعمیر شدہ تھی جو جمال پور کے ریلوے کے کارخانہ نے بنوائی تھی۔ اور پمپ لگا کر وہاں سے ٹینکی گاڑیوں میں بھر بھر کر انگریز افسروں کے لئے پانی لے جاتے تھے یہ وہی جمال پور ہے جہاں ریلوے کا ہندوستان میں سب سے بڑا کارخانہ تھا۔

چونکہ اس چشمہ کا پانی بہت صحت افزا ثابت ہوا تھا۔ اس لئے

پر انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن جب میں گیا یہ انتظام ختم ہو گیا تھا اور چشمہ عام پبلک کے استعمال میں آتا تھا۔ میں نے روزانہ اس چشمہ پر نہانے کا انتظام کیا کیونکہ ایک تو یہاں کی صفائی نسبتاً اچھی تھی۔ ہندوؤں کے چشمہ پر جہاں ہندو مرد اور عورتیں بکثرت نہاتے اور کپڑے دھوتے تھے، بہت غلاظت تھی۔ دوسرے اس کا پانی کچھ کم تھا تاہم اتنا گرم تھا کہ پانی میں بیٹھ کر نہانا تو الگ رہا میرے لئے چلو بھرنا مشکل تھا۔ مگر وہاں کے لوگ اس میں نہانے کے عادی ہونے کی وجہ سے نالی میں بیٹھ کر چلو بھر بھر کر اپنے اوپر ڈال لیتے تھے۔ تیسرے وہاں بھیڑ بھاڑ نہ ہوتی۔

اس کے متعلق ان لوگوں کا بیان تھا کہ یہاں ایک موچی نے رہنے کے لئے گھاس پھونس کی جھونپڑی بنالی تھی، اور چمڑا دھونے کے لئے زمین کھود کر پانی نکالا تو گرم نکلا۔ پھر جب گڑھے کو کچھ وسیع کیا گیا تو پانی نکل نکل کر بہنے لگ گیا اور موجودہ صورت اختیار کر لی۔ مجھے وہاں نہانے سے حیرت انگیز فائدہ ہوا۔ اور خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے میرے لئے نہانے کا سامان بھی اعلیٰ مقرر کر دیا۔

چونکہ یہ چشمہ اس علاقہ میں تھا جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو نہایت ہی وحشیانہ قتل و غارت کا نشانہ بنایا تھا۔ اور یہ حادثات ابھی تازہ تازہ تھے، اس لئے پنجاب کی مسلمان ملٹری اس علاقہ میں کافی مقیم تھی اور دن رات مسلح، فوجی پارٹیاں گشت کرتی رہتی تھیں۔

میرا عزیز عبدالحمید اس کمپنی میں ہیڈ کلرک تھا۔ جو ایمانشاء اللہ لفٹننٹ

ہے[1] جو مونگھیر کے حلقہ میں مقیم تھی۔ اور اس کمپنی کی پارٹیاں لاریوں میں اس چشمہ تک گشت کرتی تھیں۔ اس لیے میں صبح سویرے فوجی لاری میں اس چشمہ پر آجاتا۔ اور جب وہ لاری اپنی گشتی ڈیوٹی ختم کر کے ۱۲ بجے واپس جاتی تو مجھے ساتھ لے جاتی۔ میں تین چار گھنٹے خوب نہاتا اور ورزش کرتا۔ ۳-۴ روز کے بعد مجھے کافی فائدہ محسوس ہونے لگا اور خوب بھوک لگتی۔ اس پر میں کچھ ناشتہ ساتھ بھی لے جاتا۔

نہانے کے علاوہ اس چشمہ کا پانی بطور چائے جس قدر پی سکتا خوب پیتا جس کے ذائقہ میں کوئی فرق نہ تھا اور خوب ہضم ہوتا۔ پینے پر اس طرح ڈکار آتے جیسے سوڈا واٹر پینے پر آتے ہیں۔ میں چھوٹی سی ٹینکی میں بھر کر گھر بھی لے جاتا اور ہم سب وہی پانی پیتے۔ قریباً ایک ماہ مسلسل نہانے کا انتظام کیا۔ اپنی بچی کنیز احمد اور عزیزہ عبد الحمید نے کھانے پینے کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ مچھلی جو ہمیشہ میری نہایت مرغوب اور دل پسند غذا رہی تازہ بتازہ کھانے کو کثرت سے مل جاتی، کیونکہ ہم قلعہ کے آخری مغربی کنارے پر جس کی مغربی دیواریں گنگا میں تھیں ایک بڑے تنبو میں رہائش رکھتے تھے۔ جھینگا مچھلی جس کا مجھے شوق تھا اس جگہ کھائی اور دل کھول کر کھائی۔ اس طرح خدا تعالیٰ نے میری صحت بحال کرنے

---

[1] آجکل بعہدہ میجر (ریٹائرڈ) سرگودھا میں ریکارڈ افسر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔
(مرتب)

کے لئے اپنے فضل سے غیر معمولی سامان پیدا کئے اور میں نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا۔ الحمد للہ!

میرا جسم جو عرصہ دراز تک دن رات بیٹھے بیٹھے کام کرنے کی وجہ سے کافی بھاری ہو چکا تھا اور توند نکل آئی تھی بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ توند کا کہیں نام و نشان نہ رہا۔ جوڑوں میں جو درد تھا وہ بالکل دور ہو گیا۔ میں خوب دوڑیں لگاتا۔ بیٹھکیں نکالتا۔ مگر کہیں درد محسوس نہ ہوتا بھوک خوب لگتی، چہرہ پر سرخی آ گئی۔

ابھی میری رخصت کافی تھی اور بچوں کا اصرار تھا کہ میں صحت کو اور بہتر کرنے کے لئے یہاں ٹھیروں۔ میرا بچہ حمید احمد بھی تجارت کے سلسلہ میں وہاں پہنچ چکا تھا اور ایک حد تک گھر کی سی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ مگر قادیان کے لئے میرا دل اداس رہنے لگا اور آخر میں وہاں سے چل پڑا۔ میری طبیعت کا یہ انداز تھا کہ میں چند دن تو قادیان سے باہر گزار سکتا مگر پھر طبیعت اداس ہو جاتی خواہ وہاں کیسا ہی آرام و آسائش میسر ہوتی اور جلد سے جلد قادیان پہنچنے کی کوشش کرتا۔ مگر آہ! آج

فروری ۱۹۵۱ء کی ۷ تاریخ ہے جبکہ میں یہ سطور

کھاریاں میں بیٹھا لکھ رہا ہوں، قادیان سے

نکلے (۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء تا ۷ فروری ۱۹۵۱ء) پورے

تین سال، تین ماہ اور سولہ دن گزر چکے ہیں

اور اس عرصہ میں انقلاب زمانہ کے ایسے تھپیڑے کھائے ہیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آئے تھے۔ صرف قادیان کی یاد میں زندگی کے دن بسر کر رہا ہوں۔ اور اتنا بھی معلوم نہیں کہ زندگی میں قادیان کو کبھی ایک نظر بھی دیکھ سکوں گا یا نہیں ؎

مائے جیتا ہے اس کی یاد بھی   جس سے چھوٹے ہوئے زمانہ ہوا
اس سے چھوٹ کر بھی اس کی چاہ رہی   جذبۂ عاشقی فنا نہ ہوا

مجھے اپنے طور پر بعض اچھے مقامات میں بطور سیر و تفریح جانے کا موقعہ ملا۔ اس کے علاوہ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالےٰ کی خدمت گزاری کے سلسلہ میں بھی قابل دید اور قابل تعریف مقامات کو بھی دیکھنے کی صورت پیدا ہوئی۔ مثلاً دہلی، شملہ، ڈلہوزی، کشمیر، لاہور وغیرہ مگر کوئی جگہ قادیان کے مقابلہ میں میرے لئے باعثِ کشش نہ ہوئی۔ ہر جگہ چند روز کے بعد میرا جی اداس ہو جاتا۔ مگر آہ! آج ایک اجڑے پچھڑے گاؤں میں کھاریاں پڑا ہوں، اور اس کی گھٹائیں امڈ امڈ کر آتی ہیں، مگر میں ٹس سے مس نہیں ہوتا اور دل مسوس کر رہ جاتا ہوں ؎

گزری باتیں یاد جو آئیں   ہو گئیں میری آنکھیں پُرنم

مونگھیر سے واپسی پر راستہ میں رڑکی کا سٹیشن بھی پڑتا تھا اور میں نے گھر سے چلتے وقت یہ ارادہ کر لیا تھا۔ واپسی پر وہاں اتر کر وہ

جگہیں دیکھوں گا جہاں بچپن کے کچھ دن گزارے تھے، چنانچہ میں وہاں
اتر گیا اور اتفاق یہ ہوا کہ وہاں عزیزم عبدالحمید کی ہمشیرہ عزیزہ امۃ الکریم
ان دنوں رہتی تھی، ان کے ہاں ٹھیرا اور دو دن گھوم پھر کر جو جو جگہ یاد تھی
دیکھیں۔ اگرچہ تقریباً ۴۰ سال کے عرصہ میں بہت کچھ تغیرات ہو چکے تھے
اور رنگ بالکل بدلا ہوا تھا مگر شہر اور چھاؤنی کی کئی جگہوں کو میں نے
پہچان لیا۔ اور میری بچپن کی یاد تازہ ہو گئی جس سے دل کو بہت فرحت
حاصل ہوئی۔

بہار کا قتلِ عام

مونگھیر علاقہ بہار میں سنہ ۱۹۴۶ء میں میں اس وقت گیا جب وہاں خوفناک
قتلِ عام کے نہایت ہی خوفناک حادثات ہو چکے تھے اور ابھی بہار کے
علاقہ میں ریلوے میں سفر کرنا کسی حد تک مخدوش تھا کیونکہ گاڑیوں میں مسلمانوں کو
چن چن کر قتل کر دیا جاتا تھا لیکن چونکہ پنجابی مسلمانوں کی فوجی کمپنیاں
ہر جگہ پہنچ چکی تھیں اور حفاظت کا کافی انتظام ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے
یہ سفر بتوکل علی اللہ اختیار کیا۔ اور یہ بھی ارادہ کیا کہ اگر موقعہ ملا تو کوئی ایسی
جگہ بھی دیکھوں گا جہاں قتلِ عام ہوا ہو۔

مونگھیر پہنچ کر میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تو مشکل یہ پیش
آئی کہ عزیزم عبدالحمید کی کمپنی کے لئے جو علاقہ برائے نگرانی وگشت مقرر
کیا گیا تھا اور جو مونگھیر شہر کے قریب تھا وہاں کوئی بڑا حادثہ نہ ہوا

تھا، اور جو کچھ ہوا تھا اسکے نمایاں نشانات باقی نہ تھے۔ اور جہاں ایسے حادثات کے نشانات پائے جاتے تھے وہ دوسری کمپنیوں کی حدود میں تھے اور کافی دور تھے، اور ایک دوسرے کی حدود میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس مشکل کو اس طرح حل کیا گیا کہ عزیز عبد الحمید کی کمپنی کے عیسائی جوانوں کے لئے جو پادری صاحب مقرر تھے ان کو دوسری کمپنیوں میں جہاں نوجوان عیسائی بھی تھے جانے کی اجازت دی۔ انہوں نے اپنا دورہ اس طرف رکھ دیا۔

جب چند مسلح سپاہی اپنے ساتھ لے کر وہ اپنے ٹرک میں روانہ ہوئے تو میں اُن کے ساتھ ہو گیا۔ ہم کھانا وغیرہ ساتھ لے کر علی الصبح روانہ ہو گئے۔ اور دریائے گنگا کے کنارے کنارے جو سڑک بھاگلپور کو جاتی تھی اس پر چل کر ۲۵۔ ۳۰ میل کا فاصلہ طے کر کے ایک ایسے کیمپ میں پہنچے جہاں مختلف دیہات کے ستم زدہ مسلمان مرد عورتیں اور بچے ملٹری کی حفاظت میں پناہ گزین تھے۔ پادری صاحب نے ایک فوجی افسر کو اپنا اجازت نامہ دکھایا اور ہم کو کیمپ میں جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ کیمپ میں داخل ہوئے تھے کہ دو آدمی ہمیں ملے جنہوں نے مجھے السلام علیکم کہا اور دریافت کیا، کیا آپ الفضل کے ایڈیٹر ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ ہم بھی احمدی ہیں اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے جماعت کی طرف سے کیمپ میں مقرر ہیں۔ ہم نے آپکی تصویر الفضل کے جوبلی نمبر میں دیکھی ہوئی تھی۔ ان سے مل کر

بہت خوشی ہوئی۔ ان سے اس علاقہ کے احمدیوں کی خیریت دریافت کی، انہوں نے بتایا سوائے ایک نوجوان کے جو سفر پہ گیا ہوا تھا کہ واپس آتے ہوئے راستے میں شہید ہو گیا جانی طور پر اور کوئی نقصان نہیں ہوا۔ البتہ بعض احمدیوں کو مالی طور پر نقصان پہنچا ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنے مکانوں کو خطرہ کے پیش نظر چھوڑ کر خود تجویز کردہ محفوظ جگہ میں چلے گئے تو ان کے مکان لوٹ لئے گئے۔

چونکہ اس وقت قتل عام کے حادثات پر قریباً ۲ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا اس لئے انہوں نے بتایا کہ قریب کے دیہات میں تو عام نشانات مٹ چکے ہیں، البتہ دُور کے مقامات پر اب بھی بہت کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب ہمارے ساتھ چل کر ایک دو دیہات دکھانے کے لئے تیار ہو گئے اور ہم انکی رہنمائی میں کیمپ سے کافی دور پہنچ گئے۔ یہ ایسے گاؤں تھے جو خالص مسلمانوں کے تھے اور وہ کانگرس کے شیدائی اور وہاں کے معزز مسلمان کانگرس کے مشہور کارکن تھے، لیکن ظالم ہندوؤں نے انکی ایک نہ سنی اور نہایت ہی ظالمانہ طریق سے ان کا نام و نشان مٹا دیا۔

پہلا گاؤں جہاں ہم پہنچے اس کے کئی مکانات کے در و دیوار اس وقت بھی خون سے رنگے ہوئے نظر آئے۔ عورتوں کے دریدہ کپڑے اور ان کے سر کے بال جا بجا پائے گئے۔ ایسے مقامات بھی دیکھے جہاں مقتولین اور مجروحین کو جلا یا گیا تھا۔ گاؤں کا ایک کنواں بھی دیکھا جو لبالب لاشوں اور زخمیوں سے بھر کر اور مٹی ڈال کر بند کر دیا گیا۔ ایک مشہور مسلمان کا مکان

دیکھا جہاں گاؤں کی عورتیں اور بچے جان بچانے کے لیے جمع ہو گئے ان کو آگ لگا دی گئی اور سب کو بھون ڈالا گیا۔ اس مکان میں بھی جو کواں تھا وہ مستورات کی لاشوں اور دفینوں سے بھر کر بند کر دیا گیا تھا۔ غرض دو ماہ بعد بھی وہ گاؤں نہایت ہی المناک منظر پیش کر رہا تھا۔

چند مرد جنہوں نے ادھر ادھر بھاگ کر اور دھان کے کھیتوں میں چھپ کر جان بچائی تھی، گاؤں میں آ چکے تھے لیکن مخبوط الحواس، کوئی پتے کی بات ذکر تے نہ سمجھتے۔ انکی آہیں اور آنسو ختم ہو چکے تھے۔ چہرے ڈراؤنے اور خوفناک نظر آتے۔ ایک بڈھا بیمار کھڑا جس کے ہاتھوں اور چہرے پر جو زخم آئے تھے وہ ایک دو اچھے ہو چکے تھے لیکن اپنی تازگی بالکل نمایاں کر رہے تھے۔ دریافت کرنے پر سسکتے روتے اور دھاڑیں مارتے ہوئے کہا۔ معلوم نہیں میں کہاں اور کس طرح بچ گیا میرے سب عزیز ختم ہو گئے۔

اس کے بعد دوسرا گاؤں دیکھا اس کا منظر پہلے سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ اس گاؤں کے لوگوں نے حملہ آور ہجوم کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ دو تین دن تک ڈٹے رہے لیکن جو تھے دن جبکہ ایک بڑے رئیس نے اپنے نشان کے طور پر اپنا ہاتھی اور ملازمین بڑا اسلحہ دیکر بھیجے تو پھر ان کے لئے چارہ نہ رہا اور ان میں کوئی ایک آدھ ہی جان بچا سکا اس گاؤں کے اردگرد کھیتوں میں ہم نے کثرت سے عورتوں اور مردوں کی کھوپڑیاں پڑی ہوئی دیکھیں۔ انسانی لاشوں کی ہڈیاں دیکھیں جن سے

گوشت نوچنے میں درندوں نے بڑی لاپروائی سے کام لیا تھا۔ جا بجا مردوں کے جلانے کے الاؤ نظر آئے جہاں بکثرت ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ کنوئیں لاشوں سے بھر کر بند کر دئیے گئے تھے۔

اس کافی بڑے گاؤں میں ہم نے کوئی عورت یا بچہ نہ دیکھا۔ چند مرد موجود تھے جو نہ زندہ نظر آتے تھے نہ مردہ۔ عجیب بھیانک نظارہ تھا۔ ہمارا ارادہ تھا اور بھی کئی گاؤں دیکھنے کے لئے تیار تھا جہاں سے مسلمانوں کا نام ونشان نہایت ظلم وستم کے ساتھ مٹانے کی انتہائی سفاکانہ کوشش کی گئی لیکن رحم جو دیکھ چکے تھے اس سے طبیعت کو آرام تھا اس لئے واپس لوٹ آئے، اگرچہ کافی رات گئے لوٹنے پر پہنچے لیکن کسی قسم کا کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ سارے علاقہ میں سکھ ملٹری کا کافی قبضہ معلوم ہوتا تھا تاہم ہمارے متعلق کیمپ میں کافی تشویش پیدا ہو گئی۔

مچھلی کا کانٹا

ایک دفعہ اچانک میں ایک تکلیف میں مبتلا ہو گیا مگر خدا تعالیٰ نے جلدی نجات بخشی۔ واقعہ یہ ہوا کہ مغرب کے بعد دفتر میں بیٹھے ہوئے میں نے بازار سے تلی ہوئی مچھلی منگائی اور پڑھتے پڑھتے مچھلی کو بغیر دیکھے کھانے لگا۔ ایک نوالہ جو میں نے منہ میں ڈالا تو حلق میں نگلتے وقت کانٹا محسوس ہوا۔ میں نے کچھ پروا نہ کی اور کانٹا بھی نگل جانے کی کوشش کی مگر وہ حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ میں نے زور لگایا تو نیچے جانے کی بجائے حلق میں

گھس گیا مگر اس کا ذرا سا حصہ اوپر رہ گیا۔ میں نے باقی مچھلی بھی کھا لی مگر کانٹا اٹکا ہی رہا۔ اور نگلتے وقت کچھ چبھن سی محسوس ہوئی۔ میں نے اسی وقت شیخ احسان علی صاحب اور ان کے والد صاحب کو جن کی ڈاکٹری کی دکان قریب ہی تھی دکھایا۔ انہوں نے کانٹا نکالنے کی کوشش کرنے کے بعد جو ناکام ثابت ہوئی مجھے قے آور دوا دی اور وہ میں نے گھر جا کر کھانے کے لئے رکھ لی۔

میں دفتر سے کام سے بارہ ایک بجے رات کو فارغ ہونے کے بعد جب گھر گیا تو وہ دوائی استعمال کی مگر قے نہ ہوئی۔ میں نے بڑے بڑے لقمے لے کر کھانا کھایا تاکہ کانٹا اس طرح پیٹ میں چلا جائے مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ چونکہ کوئی خاص درد اور تکلیف نہ تھی۔ معمولی سی چبھن تھی اور وہ بھی لقمہ نگلنے کے وقت ہوتی۔ اس لئے میں آرام سے سو گیا۔ صبح کو اٹھا تو چبھن ویسی کی ویسی ہی تھی۔ نہ کم نہ زیادہ۔ میری خوش قسمتی تھی کہ ان دنوں حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب پنشن پر ریٹائر ہو کر قادیان آچکے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا سنایا۔ خود مجھے ساتھ لیکر نور ہسپتال میں تشریف لے آئے اور گلے میں ڈالنے والے اوزار لے کر کانٹا نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر ایک تو اوزار کافی اور موزوں نہ تھے، دوسرے حضرت میر صاحب نے فرمایا۔ میری انگلیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ جب میں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا تو پرنسپل نے مجھے کہا تھا، ڈاکٹری کے پیشہ کے لئے تمہاری انگلیاں موزوں نہیں۔ ڈاکٹر

کی انگلیاں لمبی ہونی چاہئیں۔

حضرت میر صاحب نے تقریباً ایک گھنٹہ میسر شدہ اوزاروں سے کوشش فرمائی کہ کانٹا نکل آئے مگر نہ نکلا۔ اور آپ نے مشورہ دیا کہ فوراً امرتسر چلے جاؤ اور جلد سے جلد کانٹا نکلواؤ۔ کیونکہ خطرہ ہے کہ نکلنے میں جو زخم ہو گیا ہے وہ پک نہ جائے۔

کانٹے کی وجہ سے تو کوئی زخم نہ ہوا تھا اور نہ کوئی درد تھی، لیکن اس کے نکالنے کی کوشش میں کافی زخم ہو گیا تھا، آپ نے ازراہ نوازش امرتسر سول ہسپتال کے نام تعارفی خط بھی لکھ دیا اور میں شیخ احسان علی صاحب کو ساتھ لے کر فوراً چلا گیا۔ ان دنوں امرتسر سول ہسپتال میں میاں محمد دین صاحب (جو میرے گاؤں میں پٹواری رہ چکے تھے اور جن کا ذکر میں کسی مقام پر کر چکا ہوں) کے صاحبزادہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب بھی لگے ہوئے تھے، انہوں نے جاتے ہی سول سرجن کو دکھایا اور انہوں نے اسی وقت انتہائی کوشش کی مگر کانٹا نہ نکلا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب نے بھی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح انہوں نے ڈاکٹر سوہن سنگھ صاحب کو جو انچارج تھے اور آنکھوں کا اپریشن کرنے میں بہت شہرت رکھتے تھے دکھایا۔ انہوں نے ایک دفعہ صبح اور دوسری دفعہ بعد دوپہر اپنی انتہائی کوشش صرف کی، کوکین لگا لگا کر اور چمٹیوں سے نوچ نوچ کر کافی زخم کر دیا۔ اور بہترین اوزاروں سے کام لیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اور آخر میں انگلی

سے اس مقام کو جہاں کانٹا محسوس ہوتا تھا دبا کر یہ سکھا شاہی فیصلہ سنا دیا کہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب تکلیف نہ ہوگی۔ میں واپس آ گیا اور سیدھا حضرت میر صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے فرمایا۔ یہ صورت قابلِ اطمینان نہیں اور ناسور ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اب تم لاہور جاؤ اور خان بہادر محمد بشیر صاحب کو دکھاؤ۔ جو میو ہسپتال میں آنکھ، ناک، گلے، کان اور سر کے علاج کے انچارج تھے اور اپنے فن میں بڑے ماہر تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف گو باقاعدہ طور پر جماعت احمدیہ میں شامل نہ تھے مگر امرتسر کی مشہور احمدی قاضی فیملی کے فرد تھے۔ انکی بیگم صاحبہ اور سارے بچے مخلص احمدی تھے۔ الفضل ان کے ہاں باقاعدہ جاری تھا۔ اور وہ میرے نام سے واقف تھے۔ حضرت میر صاحب نے بذریعہ تار میرے متعلق انکو اطلاع دے دی تھی اور لکھا تھا کہ جلدی سے جلد اپریشن کا انتظام کر دیں۔

جب میں قادیان سے روانہ ہونے لگا تو ایک دوست جن کا نام میں بھول گیا ہوں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ڈاکٹری کا ایک حوالہ لیکر آئے۔ جس میں لکھا تھا کہ مچھلی کا کانٹا گلے میں اٹک جانے کا ایک یہ بھی علاج ہے کہ دہی میں میٹھا ڈال کر پیا جائے۔ میں نے اسی وقت دہی منگایا اور خوب پیا۔ چونکہ حضرت میر صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر اوزاروں سے کانٹا نہ نکلے تو باہر سے گلے میں شگاف دے کر بھی نکلوایا جائے۔ اس لئے میں اپریشن کے لئے تیار ہو کر گیا تھا۔ اور چونکہ کئی وقتوں سے قریباً فاقے سے تھا اور خیال تھا کہ اپریشن ہونے پر نہ معلوم کتنے دنوں تک کھانا نہ کھا سکوں،

اس لئے گاڑی میں خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

مغرب کے بعد میں شیخ احسان علی صاحب کے ساتھ لاہور پہنچا اور سید صاڈاکٹر صاحب کے مکان پر گیا تاکہ صبح اپریشن کے لئے اُن سے وقت مقرر کرالوں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بڑے اخلاص سے پیش آئے۔ پوچھا کب کانٹا لگا ہے؟ میں نے کہا۔ آج تیسرا دن ہے۔ فرمایا بڑی جلدی آئے۔ میں نے کہا پہلے قادیان میں حضرت میر صاحب نے کوشش فرمائی۔ پھر انکے مشورہ سے امرتسر گیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب آپکی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا۔ آئیے ذرا دیکھوں تو، کیا صورت ہے۔ اور مجھے ڈرسینگ کے کمرہ میں لے گئے۔ کرسی پر بٹھا کر پہلے انگلی سے اس مقام کا پتہ لگایا جہاں کانٹا اٹکا ہوا تھا اسے نکالنے کے لیے چمٹی حلق میں داخل کی۔ چمٹی نے کانٹے کو سرے سے پکڑ لیا مگر کمبخت چھوٹ گیا۔ دوسری دفعہ پھر ڈاکٹر صاحب نے چمٹی داخل کی اور قریباً سوا انچ لمبا کانٹا کھینچ کر باہر لے آئے یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں سرانجام پا گیا۔ اور میں جو تین دن سے سخت بے چینی اور تشویش میں مبتلا تھا اور اپریشن کرانے کے ارادے سے آیا تھا، مجھے اب ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے سر سے پہاڑ جتنا بوجھ اُتر گیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کا بیحد شکر ادا کرتے ہوئے فیس پیش کی مگر آپ نے نہ لی اور یہ فرمایا دعا کر دیا کریں۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب جب کانٹا لگا تھا اگر میں اسی وقت سیدھا آپ کے پاس آجاتا اور آپ ابھی

طرح دو چار منٹ میں نکال دیتے جس طرح اب نکالا ہے تو میں سمجھتا معمولی
بات تھی۔ لیکن اب جبکہ کئی جگہ کوشش کرنے کے بعد یہاں پہنچا ہوں تو
آپ کا کمال دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا یہ خدا کا
فضل ہے کہ مجھے گردن سے اوپر کی تکالیف دور کرنے کی خاص مہارت ہے۔

غرض میں جو غم اور فکر لے کر ڈاکٹر صاحب کے شفاخانہ
میں داخل ہوا تھا، چند ہی منٹ بعد خوش و خرم وہاں سے نکلا۔ گھر ٹیلیفون(۱)
کے ذریعہ اطلاع بھیج دی اور دوسرے دن گھر پہنچ گیا۔ چونکہ میری تکلیف
اپنی پیچیدگی کی وجہ سے قادیان میں کافی مشہور ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں
انہی دنوں مچھلی کا کانٹا حلق میں اٹکنے کے دو تین واقعات بھی ہو چکے
تھے۔ اس لئے کئی عورتوں مردوں نے موسم کی بہترین مچھلی کھانا ترک کر دیا۔
اور اس کا ذکر کئی احباب نے مجھ سے کیا۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ ہوا اور وہ یہ کہ میرے حلق سے مچھلی کا
کانٹا نکلے ابھی دو چار روز ہی ہوئے تھے کہ ایک دن مسجد مبارک میں ظہر
کی نماز پڑھ کر جب میں اُترا تو احمدیہ چوک میں مچھلی بک رہی تھی۔ مچھلی اعلیٰ
قسم کی تھی اور بالکل تازہ تھی، میں نے بھی دو ڈھائی سیر کی مچھلی پسند کی اور
اسے تلوانے کے انتظار میں تھا کہ میری نظر سیڑھیوں کی طرف اٹھی جہاں ابھی
کئی احباب اتر رہے تھے۔ ان میں سے ایک دوست بابو فضل احمد صاحب
بٹالوی کو میں نے اپنی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے پایا۔ وہ آ کر سیدھے
میرے پاس آ گئے اور ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ مچھلی کا کانٹا لگنے کے بعد

لیکن آپ سے مل نہیں سکا اور نہ اظہار افسوس کر سکا۔ اب ایسی حالت میں مل رہا ہوں کہ آپ تو پھر مچھلی خرید رہے ہیں اور میں تو آپ کے واقعہ کے بعد ارادہ کر چکا ہوں، کہ کبھی مچھلی نہ کھاؤں گا۔ اب بتائیے، اظہار افسوس کروں یا اظہار خوشی؟

میں نے کہا ایک انچ بھر کانٹے سے ڈر کر مچھلی کھانا چھوڑ دینا بزدلی ہے۔ میں اسے گوارا نہیں کر سکتا، اور آپکو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ بھی مچھلی نہ کھانے کے ارادہ سے باز آجائیں۔

جس گاؤں میں میں پیدا ہوا اور ۱۲-۱۳ سال کی عمر تک پرورش پائی تھی وہاں اس زمانہ میں مچھلی کبھی دیکھنے میں بھی نہ آئی تھی اب سنا ہے وہاں کبھی کبھی چھوٹی سوفی مچھلی بکنے کو آجاتی ہے اور سستے بھاؤ تھوڑی بہت بک بھی جاتی ہے۔ قادیان میں بھی کئی سال تک مچھلی دستیاب نہ ہوتی تھی اور نہ کوئی اس سے رغبت پائی جاتی تھی۔ حتّٰی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کا زمانہ خلافت شروع ہوا اور صوبہ بہار کے کچھ لوگ ہجرت کر کے آگئے ان میں سے ایک صاحب محمد عاقل تھے جو بھاگلپور کے رہنے والے تھے۔ ان کو چونکہ کوئی مستقل کام میسر نہ تھا۔ ادھر مچھلی کھانے کے عادی تھے۔ اس لئے جب انکو معلوم ہوا کہ قادیان سے ۶-۷ میل کے فاصلہ پر دریائے بیاس ہے اور ادھر ایک گاؤں بھیرو میچھی میں کچھ احمدی بھی ہیں تو انہوں نے گنڈی کے شکار کے لئے وہاں جانا شروع کر دیا۔ انکو اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔ انہی ایام میں، ہم چند دوست بھی ان کے ہمراہ گئے، وہیں نالے کے کنارے

مچھلی پکا کر کھا آتے تھے۔ پھر دوسرے لوگ بھی جانے لگے اور اس طرح کافی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ پھر قادیان میں بھی بکنے کے لئے آنے لگی۔ اور اب جبکہ ہمیں قادیان چھوڑنا پڑا کئی کئی من مچھلی دور دور سے آکر کافی گراں فروخت ہونے لگی۔ اس طرح مجھے مچھلی کھانے سے خاص رغبت پیدا ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے گھر میں مچھلی بہت اچھی پکتی جسے اعلیٰ گھرانوں تک پسند کیا جاتا۔

موٹر کا دوسرا حادثہ

یہ حادثہ پہلے حادثے سے بہت زیادہ خطرناک تھا لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے بال بال محفوظ رکھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ میں لمبی رخصت پر تھا جو بحالیٔ صحت کی بنا پر لی گئی تھی۔ گرمی کا موسم تھا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ ڈلہوزی میں قیام رکھتے تھے اس قیام کے سارے عرصہ میں جو قریب الاختتام تھا الفضل حضور کے خطباتِ جمعہ قلم بند کر کے اخبار میں شائع کرنے کا کوئی انتظام نہ کر سکا بھی سلسلہ کلام میں حضور نے اس بارے میں ناراضگی کا اظہار فرمایا تو ناظر صاحب دعوت تبلیغ کو اس طرف توجہ ہوئی، مگر وہ پھر بھی کوئی انتظام نہ کر سکے۔

اس دوران میں مجھ سے ایک دن اتفاقیہ ملاقات ہونے پر مجھے فرمایا، اگرچہ اب حضور ایک آدھ خطبہ ہی ڈلہوزی فرمائیں گے (کیونکہ

واپسی کی تجویزیں ہونے لگ گئی تھیں) تاہم اگر تم جا سکو تو چلے جاؤ۔ میں نے کہا۔ میں تیار ہوں اور جمعرات کے دن رات کی گاڑی سے پٹھانکوٹ پہنچ گیا وہاں سے صبح سویرے لاریاں ڈلہوزی کے لئے چلتی ہیں اور راستہ یکطرفہ ہے اس لئے ساری لاریاں اکٹھی چلتی ہیں۔ میں سب سے آگے چلنے والی لاری پر سوار ہو گیا۔ اس پر دو فوجی انگریز بھی سوار تھے۔ یہ لاری جب آٹھواں میل گزر گئی تو ایک پہیہ پنکچر ہو گیا اور وہ ٹھیر گئی۔ ڈرائیور کو اپنی ہوشیاری اور اپنے سامان پر بڑا بھروسہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ پاس سے گزرنے والی قریباً سب لاریوں کے ڈرائیوروں نے جب اس سے پوچھا کہ کسی چیز یا کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں تو اسنے سب کو نفی میں جواب دیا اور وہ سب چلی گئیں۔ لیکن جب وہ ناکارہ پہیہ اتارنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ اسکے پاس ہتھوڑا نہیں ہے۔ اس کا کام اسنے پتھروں سے لیا۔ لیکن جب ناکارہ پہیہ کی بجائے زائد پہیہ چڑھانے لگا۔ تو اسنے دھرے پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ یہ اس کا پہیہ نہیں بلکہ غلطی سے کسی اور لاری کا پہیہ آ گیا ہے۔ اسپر وہ گھبرایا مگر اب کیا ہو سکتا تھا، سب لاریاں گزر چکی تھیں۔ پیچھے اطلاع پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ قریب کوئی آبادی نہ تھی۔ دھوپ لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

آخر کافی کوشش اور دوڑ دھوپ اور بڑی مشکل سے وہ لاری کا پہیہ چڑھانے میں کامیاب ہو گیا اور ہم سب سوار ہو کر پھر روانہ ہو گئے۔ لیکن ڈرائیور کو اس بات کا بالکل خیال نہ رہا کہ اب دوسری طرف لاریاں کا پٹھانکوٹ

کی طرف جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ اچانک سڑک نکلتے ہی سامنے سے لاریوں کا
ریلہ نیچے کی طرف بہتا ہوا نظر آیا۔ اگرچہ موقعہ نہایت ہی خطرناک تھا لیکن
خدا تعالیٰ کا فضل یہ ہوا کہ آمنے سامنے ڈرائیوروں کے حواس قائم رہے اور
دونوں نے اپنی اپنی لاریوں کو بریک لگانے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہ خوفناک
حادثہ صرف الفضل کے شیشے ٹوٹنے اور ٹیڑھے ہو جانے پر ختم ہو گیا۔
تھوڑی دیر تک حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے کے بعد پیچھے آنے والی لاریاں
اپنی سمت روانہ ہو گئیں اور ہماری لاری آگے چل کر پولیس چوکی پر رک
گئی اور پھر وقت مقررہ پر روانہ ہو گئی۔ غرض خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے
اس حادثہ سے بچا لیا۔ شکر الحمد للہ!

غرض متاہلانہ زندگی کے ہر قدم پر اہلیہ کو خدا تعالیٰ نے ایسی
توفیق عطا کی کہ وہ ہر طرح میرے لئے آرام، عزت اور برکت کا موجب ثابت
ہوتی رہی۔ الغرض حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام حاصل ہونے کے لئے اس نے چھوٹی سی
عمر میں کسی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہماری زندگی
کس قدر اطمینان، تسلی، خوشی اور راحت سے گزری تھی۔ اس کا اندازہ
اسی سے ہو سکتا ہے کہ میں الفضل کے دفتر میں بطور معمولی کلرک داخل ہو کر
معمولی تعلیم رکھتے ہوئے جب اعلیٰ مقام پر خدا تعالیٰ کے فضل سے
پہنچا۔ الفضل میرے ہاتھ میں دو بار سے ہفتہ میں تین بار اور تین بار سے
روزنامہ ہوا۔ اور میں اس کا چیف ایڈیٹر رہا اور اتنا لمبا عرصہ فرائض ادا کرنے
کی توفیق ملی۔ اس میں بہت بڑا حصہ گھر کی طمانیت اور سکینت کا تھا جس کا

موجب میری اہلیہ تھی۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں خدا تعالیٰ کی مصلحت کے ماتحت شادی کے بعد کئی سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ مجھے تو اس کا کوئی ایسا احساس نہ تھا لیکن اہلیہ کو بہت صدمہ تھا جو روز بروز بڑھتا جاتا تھا، انکی دادی صاحبہ ہمارے ہاں ہی رہا کرتی تھیں، میری اہلیہ سے انہیں محبت بھی بعد تھی، وہ تسلی دیتیں اور اپنے خواب سناتیں کہ مجھے تمہارے آگے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں، خدا تعالیٰ ضرور تمہاری گود بھری کریگا۔ شاید میری قسمت میں نہیں کہ میں انہیں ان آنکھوں سے دیکھ سکوں!

اہلیہ کو زیادہ تکلیف اس وجہ سے تھی کہ انکی آپا کے ہاں بھی کوئی اولاد نہ تھی، کوئی حقیقی بھائی نہ تھا، والدین فوت ہو چکے تھے۔ بغرض اولاد کا فقدان کافی خلش پیدا کر رہا تھا۔ میں انکی اس تجویز کو بھی کامیاب بنانے کی جرأت نہ کر سکتا کہ دوسری شادی کر لوں۔ کہ اسی دوران میں ایک دن حضرت صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے چند مکتوب جو بعض اصحاب کو حضور کی طرف سے لکھے گئے تھے اخبار میں شائع کرنے کیلئے پہنچے۔ ان میں سے ایک خط میں حضور نے مکتوب الیہ کو اسکے اس قسم کے خط کے جواب میں کہ میں حضور کا وقت ضائع ہونے کے خیال سے دعا کی درخواست بار بار نہیں لکھتا، لکھا ہوا تھا۔ کہ بعض اوقات شیطان کسی کو فیض سے محروم رکھنے کیلئے اس قسم کے بہانے پیش کر دیتا ہے۔

خط کسی قدر مفصل تھا اسے میں نے اخبار میں درج کر دیا اور ساتھ ہی خیال آیا کہ اس میں کئی باتیں جو بیان کی گئی ہیں مجھ پر منطبق ہوتی ہیں، مجھے بھی ان شیطانی وساوس سے اپنے آپکو بچانا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اسی وقت حضور کی خدمت میں عریضہ لکھا جس میں اولاد کے لئے دعا کی درخواست تھی۔ اسکے بعد بھی وقتاً فوقتاً لکھتا رہا۔

انہی ایام میں ظاہر سامان یہ پیدا ہوا کہ ایک دن اتفاقیہ ملنے پر بغیر کسی تمہید کے یکایک حضرت مرزا شریف احمد صاحب نے بے تکلفی سے مجھے فرمایا۔ تمہارے ہاں ابھی تک اولاد نہیں، کیا وجہ ہے۔ میں نے کہا بظاہر تو کوئی وجہ نہیں۔ فرمایا اپنا معائنہ کراؤ۔ میں نے کہا، اب امید تو ہے کہ شاید کبھی اولاد ہو جائے۔ معائنہ کا نتیجہ اگر یہ نکلا کہ مجھ میں نقص ہے تو امید ٹوٹ جائیگی اور ممکن ہے کہ اس احساس سے زندگی بے مزہ ہو جائے۔ فرمایا کسی ڈاکٹر سے معائنہ نہ کراؤ۔ میں خود معائنہ کر دوں گا۔ اگر نتیجہ خدانخواستہ تمہارے منشاء کے خلاف نکلا تو یہ سمجھ کر مطمئن رہنا کہ میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ اور اس بارے میں میری رائے سند نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس پر میں کسیقدر مطمئن ہو گیا مگر یہ خیال کر کے کہ آپ مذاقیہ گفتگو فرما رہے ہیں۔ جو میرے اتفاقیہ ملنے پر شروع ہو گئی اور سمجھ لیا کہ بات آئی گئی ہو گئی۔ گھر میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ میاں صاحب نے مذاق کیا ہو گا۔ مگر دوسرے تیسرے دن ہی معلوم ہو گیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا تھا سنجیدگی سے فرمایا تھا اور آپ مجھے تختہ مشق بنانے کا پورا پورا عزم کئے ہوئے ہیں۔

چنانچہ ایک دن بذات خود میرے مکان پر تشریف لے آئے۔
حضرت میاں صاحب کی شان اور مقام کو مدنظر رکھتے ہوئے اس رہائش گاہ کو
مکان کہنا لفظ مکان کی ہتک کرنا ہے۔ وہاں اس وقت آپکو بٹھانے کے لئے
بھی میرے پاس کوئی جگہ نہ تھی۔ مکان نہایت بوسیدہ اور بے ڈھب سا تھا
میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔ آپ الفضل کے چھاپہ خانہ میں جا بیٹھے۔ کیونکہ پریس
اس مکان کے نچلے حصہ میں تھا، اور پریس بھی چونکہ میرے انتظام میں تھا
اس وجہ سے مجھے وہاں رہنے کی اجازت تھی اور میں اس وقت تک وہاں
رہا جبتک خدا تعالٰی نے مجھے اپنا نہایت وسیع اور شاندار مکان عنایت
نہ فرما دیا۔ میں جب آپ کے پاس پہنچا تو آپ نے تفصیل کے ساتھ میرے حالات
سنے اور فرمایا۔ انشاء اللہ علاج ہو جائیگا اور دوائی میں خود دوں گا۔
چنانچہ دوسرے چوتھے روز آپنے بیاد رنگ کی چینے کے برابر سیشی
بھر کر گولیاں مجھے عنایت کیں اور صبح شام ایک ایک کھانے کی ہدایت کی،
مجھے یاد نہیں میں نے وہ ساری کی ساری ختم کیں یا نہیں کہ ایک دن حضرت
میاں صاحب نے امید افزا حالات بیان کئے اور آخرکار خدا تعالٰی نے
بچی عطا فرمائی۔ میں نے حضرت صاحب سے التجا کی کہ مجھے اس کا نام
"کنیز مرزا" رکھنے کی اجازت عنایت کی جائے۔ آپ نے تحریر فرمایا۔

کنیز احمد نام رکھو

چنانچہ یہ نہایت پیارا نگرانوکھا نام بچی کا رکھا گیا جو ماشاءاللہ
اب اپنے گھر بار اور بچوں والی ہے۔ خدا تعالٰی اسے اور اس کے میاں لفٹیننٹ

میجر شہید الحمید اور اس کے بچوں پر اپنے بیش از بیش فضل نازل کرے، دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ آمین

اس بچی کی ولادت میں ہمارے لئے بے حد خوشی اور مسرت کا سامان تھا۔ اس کے پیدا ہونے کے بعد خدا تعالیٰ نے ہمیں بڑی برکات کا مورد بنایا۔ رشتہ داروں اور دوستوں اور احباب جماعت کے علاوہ خاندان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی مسرت کا اظہار فرمایا اور دعائیں دیں۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے شملہ سے مبارکباد کا خط لکھا۔

کئی سال سے جیسے کہ ہم ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہتے تھے اور ارادہ تھا کہ اگر اولاد نہ ہوئی تو اسی میں زندگی گزار کر راہی ملک بقا ہو جائیں گے اور جس سے بہتر کوئی جگہ میسر آنے کے بظاہر سامان مفقود تھے ابھی کنیز احمد بمشکل بیٹھنا بھی نہ سیکھنے پائی تھی کہ خدا تعالیٰ نے مکان کے لئے محلہ دارالرحمت میں نہایت باموقعہ زمین مہیا ہونے کا انتظام فرما دیا۔ اس کے ساتھ ہی غیر معمولی طور پر کچھ سرمایہ حاصل ہو گیا اور میں نے تعمیر مکان کی تیاری شروع کر دی۔ پھر تعمیر مکان کے دوران میں خدا تعالیٰ جوں جوں عطا کرتا رہا خرچ ہوتا رہا اور تھوڑے ہی دنوں میں ایسی شکل کا مکان تیار ہو گیا کہ اسے دیکھ کر اور اپنی تہی دستی پر نظر کر کے خود حیرت ہوتی کہ کیونکر میسر ہو گیا۔ کنیز کی پیدائش کے بعد میری تنخواہ میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی اور ایک سال میں دو دفعہ ہوئی۔ کنیز کے بعد خدا تعالیٰ نے اس کے پانچ بھائی عنایت کئے

جن میں سب سے چھوٹا نذیر احمد بچپن میں ہی فوت ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ تھا تعالیٰ نے اور بھی کئی رنگ میں فضل کئے۔

مکان کی تعمیر میں صرف اتنا ذکر کر دینا کافی ہو گا کہ خرید زمین کے لئے حضرت والدہ ماجدہ نے روپیہ عنایت فرمایا۔ ڈھابہ میں بھرتی ڈلوا کر میں نے مکان کے لئے جو زمین قریباً دس مرلہ تیار کی تھی اور حسین مکان بنانے کا ارادہ تھا بوجہ غیر معمولی لاگت اور ڈھابے کے قریب آٹھ سو روپے میں بک گئی۔ پانچ سو روپے دفتر سے پیشگی لے لیا۔ اہلیہ نے اپنا بقیہ سارا زیور مکان پر لگا دیا، باوجود اس کے کچھ مزید قرض ہو گیا اور مکان نامکمل حالت میں تیار ہوا۔ میں ابھی اس میں نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ ابھی کہ جس مکان میں ہم کئی سال سے رہتے تھے، باوجود گھٹن اور بوسیدگی کے اس سے طبیعت بہت کچھ مانوس ہو چکی تھی، پھر اس کا کچھ کرایہ بھی دینا پڑتا تھا لیکن اہلیہ کا اصرار تھا کہ جب خدا تعالیٰ نے اپنا ذاتی مکان عطا کر دیا ہے تو جلد سے جلد اس میں چلنا چاہیئے۔

ابھی کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ میں ایک دن اُس ٹرپ میں شمولیت کے لئے نہر پر گیا جو موسم گرما میں دو تین بار نہر پر بڑی شان کے ساتھ منائی جاتی تھی اور جس میں سلسلہ کے بزرگ تک شمولیت فرماتے۔ اہلیہ نے اسی دن سامان اٹھوا کر وہاں جا کر رکھا۔ سامان ہی کیا تھا۔ دو چار پائیاں، دو تین ٹرنک، چند برتن۔ ان سے مکان کا ایک کونہ بھی پُر نہ ہوا۔ شام کے بعد نہر سے واپس آتے ہوئے مکان کے قریب سے گزرا تو اس میں روشنی نظر

نظر آئی، آگے بڑھ کر دیکھا تو وسیع کھلے صحن کے درمیان چارپائی پر اہلیہ معہ بچوں بیٹھی ہے، ایک گدھر کا لڑکا اور ایک ملازم لڑکا کھیل کود رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے اس فضل کا شکر ادا کیا۔ بعد میں جوں جوں مقدرت ہوتی گئی ہم مکانات کو کچھ اور زیادہ وسیع کرتے گئے۔ حتیٰ کہ جب ہم ستمبر ۱۹۴۷ء کو مکان سے نکلے تو اس کی پوزیشن یہ تھی، قریباً ۱۲ مرلہ میں ایک مکمل پختہ مکان اور آٹھ مرلہ سے کچھ زیادہ رقبہ میں دوسرا پختہ مکان۔ دونوں مکانوں کے درمیان نہایت گہرے، میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا کنواں۔ گرمیوں میں کبھی ہمیں برف کی ضرورت پیش نہ آتی۔ جون جولائی کی دوپہر کو بھی تازہ پانی سے نہانے پر سردی لگنے لگتی۔ بڑے مکان کے اوپر چوبارہ، شاندار بیٹھک، مکمل باورچی خانہ، بھینسوں کا کمرہ۔ تمام کمروں میں بجلی۔ بیٹھک میں بجلی کا پنکھا۔ صحن میں آم اور جامن کے دو شاندار درخت جو میں نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے۔ اور اب ہر سال بہت اچھا اور کثرت سے پھل دیتے تھے۔

کنویں کے سلسلہ میں یہ لطیفہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ چونکہ محلہ میں کئی کنوئیں ایسے تھے جن میں ۶-۷ ہاتھ پانی نکل آنے پر کافی سمجھ لیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں پانی کم ہوتا ہوتا بہت گھٹ جاتا اور گھر کے استعمال کے لئے بھی کافی نہ ہوتا۔ اس وجہ سے میں نے پہلے کیا کہ جتنا گہرا کنواں کھودنے کا سامان مہیا ہو سکے کھودا جائے۔ چنانچہ جب تک کھودنے والوں نے کہہ نہ دیا کہ اب ہمارے بس کی بات نہیں اس وقت تک بند نہ کیا گیا۔ تیرہ چودہ فٹ گہرا پانی ہوگیا، اور کبھی اپنی سطح سے ایک انچ بھی کم نہ ہوا۔

علاوہ ازیں بہت ٹھنڈا اور خوشگوار تھا ۔ مکرم قاضی محمد عبد اللہ صاحب بی اے ۔ بی ٹی ہمارے ہمسائے تھے ۔ ہمارے مکان کے بالکل شمال جانب شمال ان کا مکان تھا ، انہوں نے بھی کوآں کھودوا یا ہوا تھا ۔ جب ہم نے زیادہ گہرا کھودوانا شروع کیا اور وہ تھا بھی قریباً ان کے کوئیں کی سیدھ میں ، تو ایک دن کہنے لگے آپنے بہت گہرا کوآں کھودوانا شروع کر دیا ہے ہمارے کوئیں میں پانی پہلے ہی بہت کم ہے ، آپ کا کوآں گہرا ہونے کی وجہ سے باقی پانی بھی اس میں چلا جائیگا ۔ میں نے مذاقاً کہا ، اگر ایسا ہوا تو اول تو ہم اپنا کوآں ضرور آپکو دیدیں گے ورنہ جب ہمیں پانی آپکے کوئیں کا ہوگا تو آپ ڈول بھی کر کے بھی لے سکیں گے ۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی شدر ٹرپ کی کیفیت بھی بیان کر دوں جس میں زیادہ تر بچے اور نوجوان ہوتے کئی معمّر بزرگ بھی حصہ لیتے ۔ گرمی کے موسم میں تو ہر تعطیل کے روز کچھ نہ کچھ لوگ کھانے پینے کا سامان لے کر اس نہر پر جو قادیان کے مغرب میں واقع ہے چلے جاتے ۔ دن بھر نہایت ٹھنڈے نہر اور پاس کے کوئیں کے پانی سے نہاتے کھیلتے کودتے کھاتے پیتے اور شام کو واپس آجاتے ۔ لیکن مہینہ میں ایک آدھ بار کسی عام تعطیل کے روز خاص کر آخری جمعرات کو جنرل ٹرپ کا انتظام ہوتا ۔ چھوٹے بڑے کے لئے عام اجازت ہوتی ۔ جس کا جی چاہتا ، جا سکتا کسی قسم کی پابندی نہ ہوتی سکولوں اور کالجوں کے لڑکے بہت بڑی تعداد میں شریک ہوتے ۔ ان میں سے بورڈنگ اور ہوسٹل میں رہنے والوں کے کھانے پینے

کا انتظام تو ان کے افسر ملازمین کرتے لیکن گھریلو لڑکے آٹھ آٹھ دس دس کی
ٹولیاں بنا کر اپنا انتظام آپ کر لیتے۔ دفاتر کے کارکن بھی یہی طریق اختیار کرتے
چھوٹے چھوٹے بچے تو بکثرت جاتے۔ بعض احباب اپنے ہاں کی مستورات
کو بھی لے جاتے اور درختوں میں کپڑے تان کر ضرورت کے مطابق پردہ کا
انتظام کر لیتے۔ موضع ننگل کو جانے والے پل سے لیکر ریلوے پل تک
نہر کی پٹری کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ آن کی آن میں ایک شہر سا بس
جاتا۔ بیسیوں قناتیں اور چھولداریاں نصب ہو جاتیں۔ چولہے بنتے
کھانے پکانے میں مصروف ہو جاتے۔ خربوزوں یا آموں کے ڈھیر لگ
جاتے، کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں سج جاتیں۔ بچے کھیلتے کودتے
نہر میں نہاتے، ایک دوسرے کو پانی میں دھکیلتے، کلیلیں کرتے اور خوش
ہوتے۔ بعض لوگ جو کہ نہر کے پانی کی سردی برداشت نہ کر سکتے وہ ایک آدھ
بار نہا کر اپنی نشست گاہ میں آرام کرتے یا باتوں سے دل بہلاتے۔ پانی
میں فٹ بال کا اجتماعی میچ بھی ہوتا جس میں بھی حضرت مرزا شریف احمد
صاحب حضرت میر محمد اسحاق صاحب رضی اللہ عنہ اور حضرت حافظ روشن علی
صاحب رضی اللہ عنہ اور قمرالانبیاء حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کو بھی شرکت
فرماتے دیکھا۔ راقم نے بھی تو بیشتر آپ کو دیکھا۔

غرض تفریح اور ورزش کا یہ نہایت شاندار نہایت شریفانہ
اور نہایت منظم اجتماع موسم گرما میں دو تین بار منعقد ہوتا، اور کئی سال
سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا مگر کیا مجال کہ کبھی عورتوں اور مردوں کے اس

اجتماع میں جو سینکڑوں سے یقیناً گزر جاتا تھا، کبھی کوئی معمولی سی بدنظمی
واقعہ ہوئی ہو۔ لڑکوں کے نگراں ان کے اساتذہ ضرور خیال کئے جاتے تھے
لیکن وہ بھی انہیں مکمل آزادی دے دیتے تھے۔ اس اجتماع کا کوئی خاص ناظم
مقرر نہ ہوتا تھا لیکن اس کی کبھی کوئی ضرورت بھی پیش نہ آئی۔ نہ صرف
کبھی کسی قسم کی کشمکش یا بدمزگی نہ پیدا ہوئی بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل
سے کبھی کوئی حادثہ بھی نہ ہوا۔ چھوٹے بڑے ہنسی خوشی جاتے شروع
ہوتے اور خوش و خرم راستہ گئے سب واپس آتے رہتے۔

یہ تو جنرل ٹرپ کا ذکر ہے ورنہ گرمی کے موسم میں قریباً روزانہ ہی
کچھ نہ کچھ لوگ نہر پر نہانے کے لئے چلے جاتے۔ میں جنرل ٹرپ میں تو اپنے
دفتر کے کارکنوں کی پارٹی بنا کر جاتا، کھانے پینے کا سامان کافی لے جاتے
وہاں خود ہی کھانا پکاتے، تربوز، یا آم نہر کے پانی میں ٹھنڈے کر کے کھاتے
کھیلتے، تفریح کرتے اور شام کو سب کے ساتھ واپس آتے۔ اخبار کا کام کچھ
تو پہلے دن کر لیتے اور خبریں اور تازہ خبروں کا کام رات کو سر انجام دے کر
اخبار بھی وقت پر شائع کر دیتے۔ باقی تعطیل میں دفتر کے سب کارکنوں کو
آزادی ہوتی کہ کوئی جہاں چاہتا ہے جائے اور خواہ کسی پارٹی کے ساتھ مل جائے
یا بال بچوں کو ساتھ لیکر جائے۔ ایسی تعطیلوں میں میں عموماً بال بچوں اور دوسرے
عزیزوں کو ہمراہ لے جاتا۔

بندوق خرید لینے کے بعد میں کافی لمبے عرصہ تک اس بندوق
سے شکار کھیلنے کا شوق پورا کرتا رہا۔ سردیوں کے ایام میں ہم تین افراد

زمین۔ سید منظور علی شاہ صاحب ابن حضرت سید محمد علی شاہ صاحب باشندہ
قادیان اور شیخ احسان علی صاحب ابن ڈاکٹر فیض علی صاحب صابر کشتی پر
دریائے بیاس اور بعض اوقات دریائے راوی تک چکر لگا آتے۔ تقریباً ہر جگہ
خاطر خواہ رہائش اور شکار کا اہتمام ہوتا۔ وہاں کے احمدی [illegible] صاحب کا ہم
سے گہرے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ وہ بھی قادیان آتے اور ہمیں
انکی خدمت کا موقع ملتا۔

چونکہ مجھے صحت کی بحالی کے لئے سالانہ چھٹی نہ مل سکتی تھی بوجہ
اس کے کہ دفتر میری جگہ کوئی اور خاطر خواہ انتظام نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ میں سالہا سال کوئی رخصت نہ لے سکا اور جب گٹھ وائیں بازو کی تکلیف
بہت بڑھ گئی میں نے چھٹی لینے پر زور دیا۔ اس عرصہ میں دریا کا سیر
و شکار میری صحت کیلئے بہت مفید ہوتا۔ اس کے علاوہ [illegible]
آخری دفعہ جو فائدہ زیادہ یہ تھا کہ قتل و غارت اور لوٹ مار کے دنوں میں یہ
قادیان کے سب سے اگلے مورچوں پر میرے بچے حمید اور مجید کے کام آتی رہی
تب تک میں ٹیریٹوریل میں رہا۔ الاؤنس کی فیس بھی نہ لی جاتی تھی
لیکن جب کنیز احمد کے بعد خدا تعالیٰ نے دو توام بچے حمید احمد مجید احمد عطا
کئے اور ادھر ٹیریٹوریل والوں نے زیادہ پابندیاں شروع کر دیں اور اس سال
مجھے تین ماہ کے لئے برائے ٹریننگ طلب کر لیا تو میرے لئے ٹیریٹوریل میں رہنا
مشکل ہو گیا اور میں نام کٹا کر واپس آگیا کیونکہ دو بچوں کی پرورش بہت
مشکل کام تھا جو اکیلی اہلیہ کے بس کا نہ تھا۔ ایک رشتہ دار لڑکی کو وطن سے

بڑا ہو گیا اور وہ بڑی امداد دیتی تھی۔ تاہم گھر کا کام کاج اور دو بچوں کا دیکھ
ریکھ کافی مشقت طلب تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ میں رات اخبارات کے
مطالعہ یا مضمون لکھنے کے لئے ضروری نوٹ مرتب کرنے کا کام لے کر بیٹھ جاتا،
اور اہلیہ سو جاتیں۔ رات کے قریباً ۱۲ بجے یا ایک بجے تک بچوں کو بوتل
صاف کر کے دودھ گرم کر کے اور اس میں دوائیاں ملا کر پلانا۔ ان کے پیشاب
پاخانہ کے بعد پوتڑوں کا بدلنا اور سلانا میرا کام ہوتا۔ اس کے بعد اہلیہ دراصل
انہی کاموں کے لئے بقیہ رات جاگتیں۔ بچوں میں سے کسی کے بیمار ہو جانے
پر ہماری مشقت میں اضافہ ہو جاتا۔ دو ڈیڑھ سال کے بچے خدا تعالیٰ کے
فضل سے چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے اور جوں جوں بڑے ہوتے گئے انکی
طرف سے فراغت حاصل ہوتی گئی۔ اب خدا تعالیٰ کے فضل سے وہ دونوں
بچے جوان ہیں۔ ان میں سے ایک کی شادی بھی ہو چکی ہے۔

خدا تعالیٰ نے دو توام بچوں کے بعد تیسرا بچہ مبشیر احمد عنایت
کیا جو اس وجہ سے مجھے بہت ہی پیارا تھا کہ اسکی شکل اور شباہت
بہت کچھ والد ماجد کے ساتھ ملتی تھی۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ نے منیر احمد
عنایت کیا، اس کے بعد تنویر احمد بخشا لیکن انکی پیدائش کے ساتھ ہی
اہلیہ سخت بیمار ہو گئیں۔ ہم انکی فکر میں مارے مارے پھرتے رہے اور بچے کی
غور و پرداخت نہ ہو سکی، اور آخر وہ فوت ہو گیا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا
إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔

اس بچے کی ولادت کے تھوڑے ہی دنوں بعد اہلیہ کے پیٹ میں کچھ

ایسی تکلیف ہو گئی جو روز بروز بڑھتی جاتی اور آخر یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ پیٹ میں سخت گولہ سا محسوس ہونے لگا اور ہر وقت درد کی ٹیسیں اٹھتیں اور سخت بے چین کر دیتیں، اس کے ساتھ ہی روز بروز کمزوری بڑھتی جاتی قادیان میں ہر ممکن علاج کرنے کی کوشش کی گئی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

ایک دن جب تکلیف بہت بڑھ گئی اور ساری رات کراہتے گزری تو صبح امرتسر لے جانے کی تجویز کی گئی مگر کمزوری اور تکلیف اس قدر زیادہ تھی کہ گاڑی اور تانگہ میں بیٹھنا مشکل نظر آتا تھا۔ جوں توں کر کے امرتسر پہنچے۔ سخت گرمی بلکہ گرمیوں کی برسات کے دن تھے۔ مشن ہسپتال جس کا انتظام اعلیٰ بتایا گیا تھا۔ اس کی تجربہ کار اور ذمہ دار لیڈی ڈاکٹر پہاڑ پر چلی گئی تھیں۔ آخر میونسپل ہسپتال میں جگہ حاصل کی گئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے مریضہ کا بہت کمزور ہونا، دوسرے موسم خراب ہونے کی وجہ سے اپریشن کرنے سے انکار کر دیا۔ اور چند روز کے بعد اکتوبر میں آنے کا کہہ کر واپس بھیجدیا۔ لیکن اس دوران میں خدا تعالیٰ نے یہ فضل کیا کہ جس دن امرتسر پہنچے اسی دن سے درد کی ٹیسیں بند ہو گئیں، واپس قادیان جا کر بہت تشویش ہوئی کہ علاج کی کیا صورت ہو کہ معلوم ہوا حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحب چند روز کی رخصت پر ڈلہوزی جاتے ہوئے تھوڑے سے وقت قادیان تشریف لائے ہیں۔ میں حاضر خدمت ہوا، اپنی مشکل بیان کی۔ خدا تعالیٰ انہیں اپنے قرب کا اعلیٰ مقام عطا کرے کہ دنیا میں انکی سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔ اس کے حصول کے لئے ان کا ہر لمحہ صرف ہوتا تھا۔

باوجود وقت کی قلت کے مریضہ کو دیکھنے کے لیے میرے ساتھ چل پڑے۔ مکان پر آکر دیکھا، واقعی پیٹ میں کافی بڑا گولہ تھا۔ مگر آپ نے فرمایا، یہ غلط ہے کہ رسولی ہے اور اس کے لئے اپریشن لازمی ہے۔ آپ نے پلستر کے طور پہ لگانے کی دوا لکھ دی، اور فرمایا ایک ہفتہ کے بعد میں ڈلہوزی سے واپس آؤں گا اس وقت تک یہی لگاتے رہو۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور وہ گولہ روز بروز تحلیل ہونے لگا۔ حتیٰ کہ ایک ہفتہ کے بعد حضرت میر صاحب واپس آئے اور خود بخود میرے غریب خانہ پر تشریف لائے تو انہیں مریضہ سے پوچھنا پڑا، گولہ دائیں تھا یا بائیں، اب تو کہیں معلوم نہیں ہوتا۔

کنیز احمد کی گمشدگی

امرتسر میں اہلیہ کی تشویشناک بیماری کی وجہ سے تو پریشانی تھی ہی، اچانک اور مصیبت یہ آپڑی کہ چھوٹی بچی کنیز احمد جو ہمارے ہی پاس تھی میرے ہمراہ ہال بازار گئی۔ میں ضروری اشیاء خرید کر جب ہسپتال کو واپس لوٹا تو وہ میرے ساتھ تھی، بھیڑ بھاڑ بے حد تھی، تھوڑا ہی آگے جا کر دیکھا تو کنیز نظر نہ آئی، گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، آوازیں دیں مگر بے سود، آخر میں حواس باختہ سا ہو کر دوڑتا ہسپتال پہنچا، چیزیں پھینکیں اور پھر بازار کو لوٹ گیا۔ اہلیہ کو اس لئے نہ بتایا کہ وہ پہلے ہی بہت کمزور ہے، اس صدمہ کو شاید برداشت ہی نہ کر سکے۔ بازار میں پہنچ کر کیا کر سکتا تھا جہاں ہجوم کا نیٹ سے نیا ریلا آتا اور گزر جاتا۔ میں پاگلوں

دیا، اسنے احمدیت قبول کرلی اور دو اڑھائی سال کے بعد گھر آیا جبکہ ملتوں
کے ہاں اس کی شادی کی گئی۔ شادی کے بعد وہ اہلیہ کو ساتھ لے گیا۔ جاتے
ہوئے دونوں میاں بیوی ہمیں قادیان ملنے آئے، دو چار روز ٹھیرنے کے
بعد روانہ ہو گئے۔ میں بٹالہ تک ساتھ گیا۔ اس وقت تک قادیان میں ریل نہ
آئی تھی، بٹالہ پہنچنے پر گاڑی چھوٹ گئی اور ہمیں رات کو بٹالہ رہنا پڑا۔ یہ
آخری صحبت اور آخری ملاقات تھی جو عزیز سے نصیب ہوئی۔ عزیز ہانگ کانگ
کچھ ماہ رہنے کے بعد بیمار ہو گیا اور یہی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی

جب بیماری نے زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر لی تو عزیز
نے اہلیہ اور چھوٹی بچی کو بصد حسرت و یاس پہلے واپس بھیج دیا کہ اگر زندگی
نے وفا نہ کی تو ان کو لٹے ہوئے قافلہ کی حالت میں مصائب اور مشکلات کا سامنا
نہ کرنا پڑے اور یہ اپنے عزیزوں کے پاس پہنچ جائیں۔ ان کے گھر پہنچنے کے
تھوڑے ہی عرصہ بعد عزیز کے وفات پانے کی خبر آگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا
اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؛

دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ عزیز میرا ایک ہی بھائی
تھا۔ بڑا صابر شاکر، دوراندیش اور عقل مند تھا۔ تھا تو مجھ سے چھوٹا اور
تیسرے درجہ پر چھوٹا تھا، تعلیم بھی پانچویں چھٹی تک پاس کا لیکن کئی صفات میں
مجھ سے بڑھ کر تھا۔ سخت سے سخت محنت سے نہ گھبرانا، اور کفایت شعاری کا
خیال رکھنا اسکی خاص صفت تھی۔ کیریکٹر نہایت پاکیزہ اور مذہبی رنگ میں
رنگا ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ ملازمت سے پہلی دفعہ رخصت لے کر آیا اور

اختیار کرلی گئی، البتہ والدہ ماجدہ نے آہستہ آہستہ کوشش شروع کردی کہ گھر کی لڑکی گھر میں ہی رہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا آمنہ نے تو کسی مرحلہ پر مخالفت نہ کی البتہ اسکی والدہ کا رویہ موافقانہ نہ تھا، آخر ان کو بھی راضی کر لیا گیا۔ مجھے بھی ان سب پہلوؤں پر غور کرنے کا کافی موقعہ مل گیا۔ اس دوران میں اگر کبھی میرا ارادہ متزلزل بھی ہوا تو اہلیہ نے قائم کرنے کی کوشش کی۔ سارے حالات عرض کرکے حضرت صاحب سے مشورہ اور اجازت کی درخواست کی، اور یہ بھی گزارش کی کہ لڑکی کی تو رضامندی ہے، ممکن ہے اس کے غیر احمدی رشتہ دار رضامند نہ ہو سکیں، تو فرمایا۔ بیوہ کے لئے ولی کی ضرورت نہیں، وہ اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔

اس وقت تک خدا تعالیٰ کے فضل سے دونوں بچے حمید اور مجید پیدا ہو چکے تھے۔ باوجود اس کے اہلیہ نے اس وقت جو رویہ اختیار کیا وہ انتہائی طور پر شریفانہ اور فراخدلانہ تھا۔ اس وجہ سے میرے لئے والدہ ماجدہ کی تمنا کو پورا کرنے عزیز مرحوم کی یادگار اس کی بچی کو اپنے پاس رکھنے اور اس کی بیوہ کی ذمہ داری اٹھانے میں بہت آسانی ہو گئی، اور میں نے والدہ ماجدہ کے ارشاد پر نکاح کرلیا۔ لیکن جس دن یہ نکاح ہوا وہ ہمارے لئے ماتم سے بدتر تھا۔ رات کو نکاح ہوا اور صبح کو میں واپس آ گیا۔ اور آتے ہی دائیں پاؤں کے ٹخنے کے قریب پھوڑا نکلنے کی وجہ سے ایسا بیمار ہوا کہ تقریباً نو ماہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ اس دوران میں اہلیہ ثانی کو بھی منگالیا، کیونکہ مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

آخر خدا تعالیٰ نے شفا دی۔

جن حالات میں میں نے دوسرا نکاح کیا اُنکی رعایت سے اور اہلیہ
اوّل کے اخلاق، عادات اور میرے ساتھ اخلاص کی وجہ سے بہترین آسودہ
زندگی عطا کی اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ جوش سے اخبار کا دن رات کی
محنت سے کام کرنے کا موقعہ مل گیا۔ کیونکہ گھر کے تمام کام کاج میں حصہ لینے
سے بہت کچھ فراغت مل گئی۔ اس وقت سے سارے گھر کا خرچ مشترکہ
ہو گیا گو سونا الگ الگ تھے لیکن کھانا اکٹھا پکتا۔ عام طور پر پکانے
کھلانے کا مکمل انتظام چھوٹی بیوی کے ہاتھ میں ہوتا۔ ضروریات کی چیزیں لا کر
مہیا کرنا بڑی اہلیہ کا کام ہوتا۔ گھر میں جو چیز آتی سب چھوٹی کے سپرد کر دی۔ حتی کہ بڑی
کو خود کوئی چیز لینی ہوتی تو وہ بھی چھوٹی سے مانگتیں۔

جب چھوٹی سے بھی بچے ہو گئے تو بڑی اپنے بچوں کی نسبت ان کو
زیادہ چاہتی اور زیادہ بہتر سلوک کرتی۔ یہ اہلیہ اول کا اخلاص اور حقیقت
تھی کہ بچے سوتیلی ماں سے اپنی اپنی ماؤں کی نسبت زیادہ مانوس تھے۔ خود
بچوں کی آپس میں اتنی محبت تھی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے اب تک ہے کہ گویا
وہ سب ایک ہی ماں کے بچے ہیں۔ اس تربیت میں بھی بڑا حصہ بڑی اہلیہ
کا تھا کہ گھر میں ایسا امن اور اتفاق تھا۔ ہمارے گھر کے پاس جو چوک تھا اس
کے چاروں کونوں کے چاروں گھروں میں دو دو بیویاں تھیں۔ جنوب مشرقی
کونے پر میرا مکان تھا۔ اور جنوب مغربی کونے پر مولوی ارجمند خان صاحب
کا۔ شمال مشرقی کونے پر قاضی محمد عبد اللہ صاحب کا، اور شمال مغربی کونہ پر

بابو اللہ بخش صاحب پشاوری کا سب سے آخر بابو صاحب نے مکان بنایا۔
جب وہ ریٹائر ہو کر قادیان آئے تب معلوم ہوا کہ انکی بھی دو بیویاں ہیں
تو میں نے اس چوک کا نام دو بیویاں چوک رکھ دیا جو چل نکلا تھا۔

غرض قادیان کی سکونت کے آخری لمحہ تک خدا تعالیٰ کے فضل
سے گھر میں اتفاق اور اتحاد سے گزارا ہوتا رہا۔ پھر قادیان سے نکل کر اور
مصائب میں مبتلا ہو کر بھی خدا تعالیٰ نے اسے قائم رکھا۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ اسے
تا دیر قائم رکھے۔ آمین

دوسری اہلیہ آمنہ بیگم سے بھی خدا تعالیٰ نے اولاد دی۔ پانچ
لڑکیاں اور پانچ لڑکے۔ رشیدہ، نفیسہ، نسیم اول، نعیم احمد، کلیم احمد،
ریاض الیقین، مبارکہ، نعیمہ، بشریٰ۔ دو لڑکے نسیم احمد اول اور کلیم احمد
قادیان میں ہی فوت ہو گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

ریاض الیقین خدا تعالیٰ نے قادیان سے ہجرت کے بعد کھاریاں
اپریل سنہ ۱۹۵۰ء میں عطا کیا۔ الحمد للہ!

قادیان میں جیتے جی پہنچنا تو الگ رہا مر کر پہنچنا بھی اب تو
بظاہر حالات محال نظر آتا ہے، البتہ مجھے اپنے کئی جگر گوشے
اور سب سے بڑھ کر حضرت والدہ ماجدہ کا قیمتی وجود اس مبارک سرزمین
کے سپرد کر آئے ہیں جو حشر کے دن وہاں سے ہی برپا ہوں گے اور ان کے ذریعہ
ممکن ہے ہمارے نام وہاں پکارے جائیں۔

والدہ ماجدہ کے علاوہ اس سرزمین میں مدفون ہونے کی سعادت

ہمارے جن بچوں کو نصیب ہوئی، ان کے نام یہ ہیں :-

پہلی بچی حمیدہ بیگم بنت عزیز غلام رسول عمر ۱۵/۱۸ سال، تسنیم احمد اول بعمر ۶ سال، نعیم احمد بعمر ۳ سال، یہ دوسری اہلیہ کے بچے تھے۔ تنویر احمد یہ اہلیہ اول کا بچہ تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہوا تھا کہ دوسری بیوی کے بھی دو توام بچے پیدا ہوئے۔ تسنیم احمد اول اور اس کی بہن نسیمہ بیگم۔

والدہ ماجدہ کی خوش قسمتی میں کیا کلام ہو سکتا ہے، وہ گاؤں وطن میں رہتے تھے جہاں انہوں نے ساری عمر گزاری اور آخری عمر میں قادیان کی شہری زندگی کا عادی بنانا ان کے لئے مشکل تھا۔ علاوہ ازیں قریبی رشتہ داری بھی انہیں مجبور کرتی تھی کہ وطن میں رہیں۔ لیکن وفات سے کچھ عرصہ قبل ایک اور صورت ہوئی قادیان آنے والی تھی۔

اسے اپنے پاس سے کرایہ دے کر ساتھ لے لیا اور قادیان پہنچ گئے۔ انکے آتے ہی رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا سخت گرمی کا موسم تھا، روزہ رکھنا مشکل تھا مگر آپ نے اس بڑھاپے میں روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا تکلیف ہو جائے گی، نہ رکھیں۔ تو فرمایا معلوم نہیں اگلے سال کے روزے نصیب ہوں یا نہ ہوں، یہ جو زندگی میں آ رہے ہیں، رکھ لیتی ہوں۔

غرض بڑے اہتمام سے انہوں نے روزے رکھے، عید منائی۔ عید کے دن بڑی اچھی صحت رہی۔ بچوں سے بڑے پیار اور محبت کا اظہار کرتے رہے۔ دوسرے دن بچوں نے اپنی عید الگ منائی، کھانے پینے کی چیزیں خود تیار کیں، ان کے بنائے ہوئے کباب والدہ ماجدہ نے کھائے اور انکی بہت

دیکھیں
صفحہ نمبر
٦٨ ←

محترم مرزا محمود بیگ آف پٹی
والدماجد مرزا مبارک احمد صاحب حیدرآباد (سندھ)

دیکھیں
صفحہ نمبر
← ١١٦

مکرم میجر (ریٹائرڈ) عبدالحمید صاحب
ریکارڈ آفیسر - ریماؤنٹ ڈپو سرگودھا

خواجہ منیر احمد صاحب

باوجود وقت کی قلت کے مریضہ کو دیکھنے کے لیے میرے ساتھ چل پڑے۔ مکان پر آکر دیکھا، واقعی پیٹ میں کافی بڑا گولہ تھا۔ مگر آپ نے فرمایا، یہ غلط ہے کہ رسولی ہے اور اس کے لئے اپریشن لازمی ہے۔ آپ نے پلستر کے طور پہ لگانے کی دوا لکھ دی، اور فرمایا ایک ہفتہ کے بعد میں ڈلہوزی سے واپس آؤں گا اس وقت تک یہی لگاتے رہو۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور وہ گولہ روز بروز تحلیل ہونے لگا۔ حتیٰ کہ ایک ہفتہ کے بعد حضرت میر صاحب واپس آئے اور خود بخود میرے غریب خانہ پر تشریف لائے تو انہیں مریضہ سے پوچھا کہ گولہ دائیں تھا یا بائیں، اب تو کہیں معلوم نہیں ہوتا۔

کنیز احمدؑ کی گمشدگی

امرتسر میں اہلیہ کی تشویشناک بیماری کی وجہ سے تو پریشانی تھی ہی، اچانک اور مصیبت یہ آپڑی کہ چھوٹی بچی کنیز احمد جو ہمارے ہی پاس تھی میرے ہمراہ ہال بازار گئی۔ میں ضروری اشیاء خرید کر جب ہسپتال کو واپس لوٹا تو وہ میرے ساتھ تھی، بھیڑ بھاڑ بے حد تھی، تھوڑا ہی آگے جا کر دیکھا تو کنیز نظر نہ آئی، گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، آوازیں دیں مگر بے سود، آخر میں جو اس ہا ختہ سا ہو کر دوڑتا ہسپتال پہنچا۔ چیزیں پھینکی اور پھر بازار کو لوٹ گیا۔ اہلیہ کو اس لئے نہ بتایا کہ وہ پہلے ہی بہت کمزور ہے، اس صدمہ کو شاید برداشت ہی نہ کرسکے۔ بازار میں پہنچ کر کیا کرسکتا تھا جہاں ہجوم کا نٹے سے نیا ریلا آتا اور گزر جاتا۔ میں پاگلوں

کی طرح کبھی کسی طرف دوڑتا ہوا چلا جاتا اور کبھی کسی طرف، مگر ہاتھ کچھ نہ آتا آخر جب تھک ہار کر چُور ہو گیا اور بھاگنے دوڑنے کی سکت نہ رہی تو ہسپتال کی طرف رُخ کیا۔ غم اور صدمہ کی وجہ سے اس وقت زمین گھومتی اور آسمان چکر کھاتا نظر آتا تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مجھے اس نے جلدی ہی اس صدمہ عظیم سے بچا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اہلیہ کنیز کا بچہ پکڑے کھڑی ہیں تاکہ مجھے اطلاع ہو سکے۔ میں نے دوڑ کر بچی کو گلے لگا لیا۔ اور خوب خوشی کے آنسو بہائے۔ اس دن کے صدمہ کا اثر میرے قلب پہ ایسا پڑا کہ پھر جب کبھی وہاں سے گزرا مجھے یہ ہچکی شروع ہو جاتی اور طبیعت پریشان ہونے لگتی۔

انسان کی قسمت دیکھئے کہ ایک وقت وہ تھا کہ جب میں اور مجھ سے زیادہ میری اہلیہ اولاد کے لئے ترستی تھی، اور رات دن دعائیں کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ اس نعمت سے ہمیں بھی نوازے، لیکن پھر وہ وقت بھی آ گیا جب اہلیہ نے اپنی ہمشیرہ کا یہ مشورہ بہت کچھ ہچکچانے اور تردد میں پڑے رہنے کے باوجود آخر مان ہی لیا اور میں نے بھی اس کی اجازت دے دی تاکہ برتھ کنٹرول کر لیا جائے کیونکہ اہلیہ کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس کے بعد اولاد تو بالکل بند ہو گئی مگر اور کئی قسم کے عوارض لاحق ہو گئے جو ابھی تک تکلیف کا موجب ہو رہے ہیں۔

برادرم غلام رسول صاحب کی شادی اور وفات

خدا تعالیٰ بڑی بڑی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے میرے چھوٹے بھائی غلام رسول پر جو چھوٹی عمر میں ہی ہانگ کانگ میں ملازمت کے لیے چلا گیا، اور جب ملازمت حاصل کرنے میں اسے سخت دقت پیش آئی تو اس نے مجھے اطلاع دی۔ مجھے یہ خط شملہ میں ملا جہاں میں حضرت صاحب کے ہمراہ تھا۔ میں نے حضور سے عرض کیا اور آپ نے میاں غلام مجتبیٰ صاحب[۱] کو جو ہانگ کانگ جیل میں اچھے عہدہ پر فائز تھے اور مخلص احمدی تھے سفارشی خط تحریر فرمایا۔ انہوں نے بواپسی حضور کی خدمت میں لکھا کہ حضور کا خط ملنے کے بعد سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ غلام رسول کو ملازم کرا دیا۔ اس کے بعد کسی اور کام کی طرف متوجہ ہوا۔ حضور نے وہ خط مجھے دیدیا اور میں نے میاں صاحب موصوف کو شکریہ کا خط لکھدیا۔

عزیز موصوف نے چھوٹی سی عمر میں اور تھوڑے سے عرصہ میں کافی ترقی کی۔ شرافت اور اچھے کیریکٹر کی وجہ سے بھی اچھی شہرت قائم کی۔ میاں صاحب موصوف اس پر روز بروز مہربان ہوتے گئے۔ اسے ضروری محکمانہ امتحانات انگریزی اور چینی زبان میں پاس کرنے میں کافی مدد

---

[۱] یعنی قاری غلام مجتبیٰ صاحب جو قاری غلام یٰسین صاحب اور قاری غلام محمد صاحب کے بھائی تھے۔

دی، اسنے احمدیت قبول کر لی اور دو اڑھائی سال کے بعد گھر آیا جبکہ ملموں کے ہاں اس کی شادی کی گئی۔ شادی کے بعد وہ اہلیہ کو ساتھ لے گیا۔ جاتے ہوئے دونوں میاں بیوی ہمیں قادیان ملنے آئے، دو چار روز ٹھیرنے کے بعد روانہ ہو گئے۔ میں بٹالہ تک ساتھ گیا۔ اس وقت تک قادیان میں ریل نہ آئی تھی، بٹالہ پہنچنے پر گاڑی چھوٹ گئی اور ہمیں رات کو بٹالہ رہنا پڑا۔ یہ آخری صحبت اور آخری ملاقات تھی جو عزیز سے نصیب ہوئی۔ عزیز ہانگ کانگ کچھ ماہ رہنے کے بعد بیمار ہو گیا اور یہی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی جب بیماری نے زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر لی تو عزیز نے اہلیہ اور چھوٹی بچی کو بصد حسرت ویاس اپنے لئے واپس بھجوا دیا کہ اگر زندگی نے وفا نہ کی تو ان کو لٹے ہوئے قافلہ کی حالت میں مصائب اور مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے اور یہ اپنے عزیزوں کے پاس پہنچ جائیں۔ ان کے گھر پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد عزیز کے وفات پانے کی خبر آ گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ عزیز میرا ایک ہی بھائی تھا۔ بڑا صابر شاکر، دوراندیش اور مستقل مزاج تھا۔ تھا تو مجھ سے چھوٹا اور تیسرے درجہ پر چھوٹا تھا، تعلیم بھی پانچویں جماعت تک پاس کی لیکن کئی صفات میں مجھ سے بڑھ کر تھا۔ سخت سے سخت محنت سے نہ گھبرانا، اور کفایت شعاری کا خیال رکھنا اسکی خاص صفت تھی۔ کیریکٹر نہایت پاکیزہ اور مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ ملازمت سے پہلی دفعہ رخصت لے کر آیا اور

اور اپنی شادی کے اخراجات اسکے سر پر تھے، پھر بھی نہ صرف میرے لئے بلکہ اپنی بھابی جان کے لئے بھی کافی قیمتی کپڑے لایا اور نقدی کی صورت میں بھی مدد کی، پھر واپس جا کر بھی روپے روانہ کئے۔ مگر میں بڑا بھائی ہونے کے باوجود بچپن میں بھی اسکی کوئی مدد نہ کر سکا۔ بھابی جان سے اسے بڑی محبت تھی اور ان کا بہت ہی احترام کرتا، وہ بھی اس پر جان چھڑکتیں اس کی شادی کا اہتمام کرنے اور اس کی خوشیاں منانے کے لئے کافی عرصہ قبل وطن پہنچ گئیں اور ایسی حالت میں اکیلی پہنچیں جبکہ کنیز احمد ابھی چند ماہ کی تھی۔ کئی سو روپے کا زیور جو انہوں نے اپنے اہتمام سے قادیان میں بنوایا تھا، ان کے پاس تھا۔ کچھ کپڑے بھی تھے کہ مغرب کے قریب جبکہ سرائے عالمگیر کے سٹیشن پر اتریں تو جو آدمی گھر سے سواری لیکر آیا ہوا تھا وہ سارا دن انتظار کرنے کے بعد واپس جا چکا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب نے نہ معلوم وہ کون تھے، خدا تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے! ایک مسلمان ریلوے ملازم کے گھر انکی رہائش کا انتظام کر دیا اور وہ صبح سویرے قلی لیکر چند میل دور ایک گاؤں میں جہاں میری ہمشیرہ رہتی تھی بخیر و عافیت پہنچ گئیں اور اس حالت میں انہیں دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔

شادی بڑی مسرت اور شادمانی سے انجام پائی۔ اہلیہ باوجود بیمار ہو جانے کے برات کے ساتھ تین چار میل دور گئیں اور وہاں جا کر زیادہ بیمار ہو گئیں اور گھوڑے پر بٹھا کر لانا بھی مشکل ہو گیا کیونکہ راستہ پہاڑی تھا، تاہم خوش تھیں کہ ایسے موقعے روز روز کہاں نصیب ہو سکتے ہیں، یہ

چند روز رہ کر واپس آگئے۔ اس کے بعد عزیز سے اس وقت ملاقات ہوئی جو آخری تھی جب ہانگ کانگ جاتے ہوئے قادیان آیا۔

والدہ ماجدہ کی طرف سے جب عزیز کی وفات کی خبر قادیان پہنچی تو سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ جوں توں کر کے میں دفتر سے گھر پہنچا، بات منہ سے نہ نکلتی تھی، آنسو بے اختیار رواں تھے۔ (اب جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں آنسو اُمڈے ہوئے ہیں اور لکھنا مشکل ہو رہا ہے)۔ اہلیہ بھی خط پڑھ کر بے تحاشا رونے لگ گئیں، آخر رو دھو کر جب تھک گئے تو خیال آیا کہ جلد سے جلد اُس ماں کے پاس پہنچنا چاہیئے جس کا لائق فرمانبردار اور خدمت گزار نوجوان بچہ چند ماہ کی بچی اور ۱۳-۱۴ سال کی نوجوان بیوہ کو بلکتے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بچہ جسے اس نے بیوگی کی کٹھن اور پر مصائب زندگی میں خون جگر پلا پلا کر پالا، جو اس کی آنکھوں کے سامنے جوان ہوا جس کی اس نے بڑے چاؤ سے شادی کی، اور جس کے متعلق اسے امید تھی کہ اس کا بڑھاپا اُن کے طفیل آرام سے کٹ جائیگا۔ اب جب اسے یہ بتایا گیا ہوگا کہ تمہارے [illegible] مشیت الٰہی کے ماتحت اس کا بچہ منوں مٹی کے نیچے چھپ چکا ہے تو اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ پھر جلد سے جلد اس بیچاری مصیبت کی ماری کے پاس جانا چاہیئے جس کا سہاگ لٹ گیا۔ وہ سہاگ جس کا اسے صرف خواب دیکھا، اور خواب بھی ایسا جس کا نظارہ آنکھ کھولنے سے پہلے ہی بدل گیا اور اسے ایک ننھی سی جان سمیت مصائب اور مشکلات کے ایسے سمندر میں

دھکیل گیا جس کا کوئی کنارا نظر نہیں آتا۔

لیکن مصیبت پر مصیبت یہ آپڑی کہ برسات کا موسم تھا، کئی روز سے متواتر بارش ہو رہی تھی، قادیان کو جھیل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اطلاعات بتاتی تھیں کہ راستہ میں خاص کر بٹالہ کے قریب کافی پانی بہ رہا ہے۔ مگر اسی حالت میں تانگہ لیکر چل پڑے، گرتے پڑتے بٹالہ پہنچ کر گاڑی پر سوار ہوئے۔ مصیبت کا سفر، شدید اور گھبرا دینے والی گرمی کا موسم، چھوٹی بچی کا ساتھ، بچی کی ماں کو متعدد ٹیکے دور راستہ میں پانی کی قلت، غرض ان سب اسباب نے مل کر میری جان کو بنا دی اور یہ چھوٹا سا سفر جسے تین آٹھ بجے کر کے پیدل ہم نے خوشی طے کر لیا کرتا تھا گھوڑے پر طے کرنا محال ہو گیا۔ بڑی مشکلوں سے گھر پہنچے۔ والدہ ماجدہ اور مرحوم کی بیوہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ دو دھوئے جس قدر رو سکتے تھے۔ خود بھی خدا تعالیٰ کی رضا پر صبر کرنے کی کوشش کی اور دوسروں کو بھی اسکی تلقین کی۔ اس وقت میرے تایا صاحب زندہ تھے، ان کی داستانِ مصیبت سنی نہ جاتی تھی انکی اپنی نرینہ اولاد نہ تھی۔ ہم دونوں بھائیوں کو انہوں نے اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار اور محبت سے پالا۔ ان کے پاس جو تعزیت کے لئے آتا اس سے کہتے میں اس وقت تک اپنے خاندان کے ۸۰-۸۵ افراد کو اپنے ہاتھوں قبروں میں پہنچا چکا ہوں، مگر نہ معلوم مجھ سے موت کیوں بھاگتی ہے! میں یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود زندہ ہوں۔ ہمارے سارے

خاندان میں صرف یہ (یعنی میں) ایک رہ گیا ہے اور اس کے بھی کوئی اولاد نہیں۔ یہ کہہ کر رونا شروع کر دیئے۔ اس وقت تک اگرچہ خدا تعالےٰ نے کینیز عطا کر دی تھی، لیکن اس طرف لڑکیوں کو اولاد نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صرف لڑکوں کو اولاد قرار دیا جاتا تھا۔

دوسری شادی کی تقریب

میں چند روز کی چھٹی لیکر آیا تھا جب وہ ختم ہو گئی تو میں واپس چلا۔ والدہ ماجدہ نے چلتے وقت علیحدگی میں صرف اتنا فرمایا۔

"بیٹا! آمنہ (بیوہ عزیزم غلام رسول) کا اب کیا بنے گا؟"

آمنہ ان کے بھائی کی لڑکی تھی۔ اہلیہ چونکہ اس بارے میں اشارۃً مجھ سے ذکر کر چکی تھیں اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ آمنہ کو ہم گھر میں بلا رکھیں گے میں نے صرف اسی بات کا ذکر کیا اور کہا، غلام رسول کی یادگار اسکی بہن کی خاطر میں ہر بوجھ اٹھانے کے لئے تیار رہوں بشرطیکہ آمنہ کی رضامندی ہو، لیکن اگر وہ نہ چاہے تو کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اسے اجازت ہونی چاہیئے کہ اپنا زیور وغیرہ سب اپنے پاس رکھے۔

والدہ ماجدہ نے میری گفتگو پسند نہ فرمائی لیکن اہلیہ کی بے حد تعریف کی کہ اسنے بڑی عقل اور سمجھ کی بات کہی ہے، حالانکہ اس کے متعلق خیال تھا کہ سب سے زیادہ مخالفت کرے گی۔

چونکہ اس قسم کے ذکر کا نہ وقت تھا نہ ضرورت، اس لئے خاموشی

اختیار کر لی گئی، البتہ والدہ ماجدہ نے آہستہ آہستہ کوشش شروع کر دی کہ
گھر کی لڑکی گھر ہی میں رہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا آمنہ نے تو کسی مرحلہ پر
مخالفت نہ کی البتہ اسکی والدہ کا رویہ موافقانہ نہ تھا، آخر ان کو بھی راضی کر
لیا گیا۔ مجھے بھی ان سب پہلوؤں پر غور کرنے کا کافی موقعہ مل گیا۔ اس
دوران میں اگر کبھی میرا ارادہ متزلزل بھی ہوا تو اہلیہ نے قائم کرنے کی
کوشش کی۔ سارے حالات عرض کر کے حضرت صاحب سے مشورہ اور اجازت
کی درخواست کی، اور یہ بھی گزارش کی کہ لڑکی کی تو رضامندی ہے، ممکن
ہے اس کے غیر احمدی رشتہ دار ہامی نہ ہو سکیں، تو فرمایا۔ بیوہ کے لئے
ولی کی ضرورت نہیں، وہ اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔

اس وقت تک خدا تعالیٰ کے فضل سے دونوں بچے حمید اور مجید
پیدا ہو چکے تھے۔ باوجود اس کے اہلیہ نے اس وقت جو رویہ اختیار کیا
وہ انتہائی طور پر شریفانہ اور فراخدلانہ تھا۔ اس وجہ سے میرے لئے والدہ
ماجدہ کی تمنا کو پورا کرنے عزیز مرحوم کی یادگار اس کی بچی کو اپنے پاس رکھنے
اور اس کی بیوہ کی ذمہ داری اٹھانے میں بہت آسانی ہو گئی، اور میں نے
والدہ ماجدہ کے ارشاد پر نکاح کر لیا۔ لیکن نصیبی دلہ یہ نکاح جو کہ وہ ہمارے
لئے ماتم سے بدتر تھا۔ رات کو نکاح ہوا اور صبح کو میں واپس آ گیا۔
اور پہنچتے ہی دائیں پاؤں کے ٹخنے کے قریب پھوڑا نکلنے کی وجہ سے
ایسا بیمار ہوا کہ قریباً نو ماہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ اس دوران
میں اہلیہ ثانی کو بھی منگا لیا، کیونکہ مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

آخر خدا تعالیٰ نے شفا دی۔

جن حالات میں میں نے دوسرا نکاح کیا اُن کی رعایت سے اور اہلیہ اوّل کے اخلاق، عادات اور میرے ساتھ اخلاص کی وجہ سے بہترین آسودہ زندگی خدا کی دین اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ بہتر طریقے سے اخبار کا دن رات کی مصروفیت سے کام کرنے کا موقعہ مل گیا۔ کیونکہ گھر کے کام کاج میں حصہ لینے سے بہت کچھ فراغت مل گئی۔ اس وقت سے سارے گھر کا خرچ تو میرا ہی مشترک ہو گیا گو سونے کے الگ الگ تھے لیکن کھانا اکٹھا پکتا۔ عام طور پر پکانا بڑی کھانے کا مکمل انتظام چھوٹی بیوی کے ہاتھ میں ہوتا۔ ضروریات کی چیزیں گھر کی مہیا کرنا بڑی اہلیہ کا کام ہوتا۔ گھر میں جو چیز آتی چھوٹی کے سپرد کر دی۔ حتیٰ کہ بڑی کو خود کوئی چیز لینی ہوتی تو وہ بھی چھوٹی سے مانگتیں۔

جب چھوٹی سے بھی بچے ہو گئے تو بڑی اپنے بچوں کی نسبت ان کو زیادہ چاہتی اور زیادہ بہتر سلوک کرتی۔ سچ یہ ہے کہ بڑی کا اچھا سلوک یہ حقیقت تھی کہ بچے سوتیلی ماں سے اپنی اپنی ماؤں کی نسبت زیادہ مانوس تھے۔ خود بچوں کی آپس میں اتنی محبت تھی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے اب تک ہے کہ گویا وہ سب ایک ہی ماں کے بچے ہیں۔ اس ترتیب میں بھی بڑا حصہ بڑی اہلیہ کا تھا کہ گھر میں ایسا امن اور اتفاق تھا۔ ہمارے گھر کے پاس جو چوک تھا اس کے چاروں کونوں کے چاروں گھروں میں دو دو بیویاں تھیں۔ جنوب مشرقی کونے پر میرا مکان تھا۔ اور جنوب مغربی کونے پر مولوی ارجمند خان صاحب کا۔ شمال مشرقی کونہ پر قاضی محمد عبد اللہ صاحب کا، اور شمال مغربی کونہ پر

بابو اللہ بخش صاحب پشاوری کا سب سے آخر بابو صاحب نے مکان بنایا۔
جب وہ ریٹائر ہو کر قادیان آئے تب معلوم ہوا کہ انکی بھی دو بیویاں ہیں
تو میں نے اس چوک کا نام دو بیویاں چوک رکھ دیا جو چل نکلا تھا۔

غرض قادیان کی سکونت کے آخری لمحہ تک خدا تعالیٰ کے فضل
سے گھر میں اتفاق اور اتحاد سے گزارا ہوتا رہا۔ پھر قادیان سے نکل کر آکر
مصائب میں مبتلا ہو کر بھی خدا تعالیٰ نے اسے قائم رکھا۔ دعا ہے کہ خدا اسے ہمیشہ کے لئے
تا دیر قائم رکھے۔ آمین

دوسری اہلیہ آمنہ بیگم سے بھی خدا تعالیٰ نے اولاد دی۔ پانچ
لڑکیاں اور پانچ لڑکے۔ رشیدہ، نسیمہ، نسیم احمد اول، نعیم احمد، کلیم احمد،
ریاض الحق، مبارکہ، نعیمہ، بشریٰ۔ دو لڑکے نسیم احمد اول اور نعیم احمد
قادیان میں ہی فوت ہو گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

ریاض الحق خدا تعالیٰ نے قادیان سے ہجرت کے بعد کھاریاں
اپریل ۱۹۵۰ء میں عطا کیا۔ الحمد للہ!

قادیان میں جیتے جی پہنچا تو الگ رہا مرکر پہنچنا بھی اب تو
بظاہر حالات محال نظر آتا ہے، البتہ ہمارے کئی جگر گوشے
اور سب سے بڑھ کر حضرت والدہ ماجدہ کا قیمتی وجود اس مبارک سرزمین
کے سپرد کئے ہوئے ہیں جو حشر کے دن وہاں سے ہی برپا ہوں گے اور ان کے ذریعہ
ممکن ہے ہمارے نام وہاں پکارے جائیں۔

والدہ ماجدہ کے علاوہ اس سرزمین میں مدفون ہونے کی سعادت

ہمارے جن بچوں کو نصیب ہوئی، ان کے نام یہ ہیں :-

پیاری بچی حمیدہ بیگم بنت عزیز غلام رسول عمر ۱۸½ سال، تسنیم احمد اول بعمر ۶ سال، نعیم احمد بعمر ۳ سال، یہ دوسری اہلیہ کے بچے تھے۔ تنویر احمد یہ اہلیہ اول کا بچہ تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہوا تھا کہ دوسری بیوی کے بھی دو توام بچے پیدا ہوئے۔ نسیم احمد اول اور اس کی بہن نسیمہ بیگم۔

والدہ ماجدہ کی خوش قسمتی میں کیا کلام ہو سکتا ہے، وہ [illegible] وطن میں رہتے تھے جہاں انہوں نے ساری عمر گزاری اور آخری عمر میں دیہات کی شہری زندگی کا عادی بنانا ان کے لئے مشکل تھا۔ علاوہ ازیں قریبی رشتہ داری بھی انہیں مجبور کرتی تھی کہ وطن میں رہیں۔ لیکن وفات سے کچھ عرصہ قبل ایک اور صورت ہوئی قادیان آنے والی تھی۔

اسے اپنے پاس سے کرایہ دے کر ساتھ لے لیا اور قادیان پہنچ گئے۔ انکے آتے ہی رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا سخت گرمی کا موسم تھا، روزہ رکھنا مشکل تھا مگر آپ نے اس بڑھاپے میں روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا تکلیف ہو جائے گی، نہ رکھیں۔ تو فرمایا معلوم نہیں اگلے سال کے روزے نصیب ہوں یا نہ ہوں، یہ جو زندگی میں آئے ہیں، رکھ لیتی ہوں۔

غرض بڑے اہتمام سے انہوں نے روزے رکھے، عید منائی۔ عید کے دن بڑی اچھی صحت رہی۔ بچوں سے بہت پیار اور محبت کا اظہار کرتے رہے۔ دوسرے دن بچوں نے اپنی عید الگ منائی، کھانے پینے کی چیزیں خود تیار کیں، ان کے بنائے ہوئے کباب والدہ ماجدہ نے کھائے اور انکی بہت

دیکھیں
صفحہ نمبر
۶۸ ←

محترم مرزا محمود بیگ آف پٹی
والد ماجد مرزا مبارک احمد صاحب حیدرآباد (سندھ)

دیکھیں
صفحہ نمبر
۱۱۶ ←

مکرم میجر (ریٹائرڈ) عبدالحمید صاحب
ریکارڈ آفیسر - ریماؤنٹ ڈپو سرگودھا

خواجہ منیر احمد صاحب

کیپٹن (پنشنر) ملک خادم حسین

باوجود ناتجربہ کاری، کم عمری اور کم علمی کے میں نے جب ایڈیٹری کی وادی میں قدم رکھا تو اگرچہ اس وقت بھی بہت پُرخار تھی، اندرونی اور بیرونی مخالفت زوروں پر تھی، لیکن جوں جوں خلافت کو استحکام حاصل ہوتا گیا اور جماعت کا قدم ترقی کی طرف بڑھتا گیا، اندرونی اور بیرونی مخالفت میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ نئے سے نئے رنگ اختیار کرتی چلی گئی جس سے زیادہ اخبار کو نمٹنا پڑتا تھا اور یہ سب مرحلے خدا تعالیٰ کے فضل سے کس آسانی اور سہولت کے ساتھ طے ہوتے گئے کہ آج بھی ان حالات پر غور کرنے سے حیرت ہوتی ہے۔ غیر مبائعین کی مہم کے سوا جو کہ شروع خلافت سے ہی پیش آگئی اور آخر تک کسی قسم کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جاری رہی اور بھی کئی قسم کی مہمات پیش آتی رہیں اور خدا تعالیٰ کے فضل سے الفضل ان میں نہایت کامیاب رہا۔

مثلاً ان میں سے ایک بہائیت کا فتنہ تھا ——— ایک عرصہ سے ایک مولوی صاحب جن کا نام محفوظ الحق تھا حضرت حافظ

بقیہ حاشیہ

رشتہ کی صورت محترمہ دادی جان کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس وقت میں نے ماں اور بیٹے کی جو حالت دیکھی ہر وقت میری آنکھوں میں رہتی ہے اور وہ حالت یہ تھی کہ ماں پر نزع کی حالت شروع ہو چکی تھی اور بیٹا پاس کھڑا خدا تعالیٰ سے دعائیں کر رہا تھا۔ میں چونکہ پاس ہی تھا محترم والد صاحب نے مجھے فرمایا قرآن مجید لاؤ اور سورۃ یٰسین پڑھو

روشن علی صاحب کے ایک تبلیغی دورہ میں احمدیت قبول کر کے قادیان میں رہائش رکھتے تھے، آدمی ہوشیار اور ذہین تھے، تحریر کا ملکہ بھی رکھتے تھے میل ملاپ میں ماہر تھے، انہوں نے اچھا اثر پیدا کر لیا۔ ذرا ایک بار میری رخصت کے ایام میں انکو اخبار کا ایڈیٹر بننے کا موقعہ بھی مل گیا لیکن دراصل وہ بہائی تھے اور نہایت ہی گہرے بہائی۔ انہوں نے مہر محمد خان صاحب شہاب کو جو اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اپنے زیر اثر کر لیا اور دونوں نے بہت خفیہ رنگ میں بہائیت کی اشاعت کرنے لگے لیکن جلدی ہی راز فاش ہو گیا اور دونوں کو جماعت سے الگ کر کے قادیان سے نکال دیا گیا۔ اس پر الفضل نے باب اور بہاء اللہ کے متعلق بہت کچھ لکھا اور جماعت کو اس کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی اور جماعت اس فتنہ سے بالکل محفوظ رہی

انہی دنوں دیوبندیوں سے مباہلہ کے متعلق کافی بحث ہوئی

میں اسی وقت قرآن شریف لے کر آیا اور سورہ یٰسین شروع ہی کی تھی کہ محترمہ دادی جان کو تقریباً آخری سانس آ رہے تھے۔ جو عورت پاس بیٹھی ہوئی تھی اس نے سمجھا کہ سانس آنا بند ہو گیا اور اسنے منہ کو بند رکھنے کے لئے منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ میں فوراً اٹھا اور اس عورت کو کہا کہ ابھی سانس آ رہا ہے۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ محترم والد صاحب نے بیتاب ہو کر دوڑے اور منہ سے کپڑا کھول دیا، اور پھر کچھ دیر کے بعد باندھنے کی اجازت دی۔ خاکسار خواجہ منیر احمد

ابتداء تو معمولی سی بات سے ہوئی۔ قاضی اکمل صاحب نے چند سطری نوٹ مسمری طور پر لکھ کر دیوبندیوں کو توجہ دلائی کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مباہلہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، صداقت احمدیہ کے متعلق کیوں مباہلہ نہیں کرتے؟

اس پر جو گفتگو شروع ہوئی تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دیوبندیوں نے میر کرم شاہ صاحب کو اپنا نمائندہ مقرر کر دیا اور حضرت صاحب نے مجھے اپنا قائم مقام قرار دے کر میرے نام سے شائع ہونے والی تحریروں کی تصدیق فرمانی شروع کر دی۔ فریقین کی طرف سے بہت سے اشتہارات اور پمفلٹ شائع کئے گئے مگر اصل مسئلہ حل نہ ہوا۔ اور دیوبندی آخر کار تو منحرف ہو گئے کہ باوجود بار بار توجہ دلانے و مطالبہ کرنے کے پھر نہ بولے۔

قادیان میں گائے ذبح کرنے کا معاملہ بھی بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ اس کی ابتداء شرارت کی معمولی بات سے ہوئی۔ ایک غیر احمدی [illegible] گوشت لا کر بازار میں کباب بنا کر بیچتا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے شور جھگڑا کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا، اس نے کباب پکا کر بیچنے کی ایک دکان بھی کھول دی۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اگر کوئی حلال چیز کو حرام کر کے کھانے سے منع نہیں کیا۔ لیکن ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ گائے کا گوشت جو ہمارے لئے حلال ہے اسے کھانے کی ہمیں قانونی بھی اجازت ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے کوشش شروع کی۔ دفتری جدوجہد کے علاوہ الفضل نے پر زور طریق پر اپنے اس حق کو پیش کیا۔ اور باوجود اس کے کہ اکثر حکام بھی خلاف تھے اور وہ طرح طرح سے رکاوٹیں پیش کرتے تھے۔ حتی کہ بعض غیر احمدیوں کو بھی

صلح کے متعدد ایڈیٹر بدلے، کوئی الفضل کا مقابلہ نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ انہوں نے الفضل کے ساتھ تبادلہ بند کر دیا اور الفضل کے دفتر میں پیغام کا بھیجنا بند کر دیا۔ اس پر اخبار میں بھی کئی بار انکو توجہ دلائی گئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ قیمتاً جاری کرنے کیلئے کہدیا مگر پھر پیغام کی شکل نظر نہ آئی۔ غرض جبتک میں ایڈیٹر رہا الفضل کے تبادلہ میں یا قیمتاً پیغام جاری نہ ہوگا۔ حالانکہ پیغام ہفتہ وار اور الفضل روزانہ تھا۔ غرض آخر وقت تک میں پیغامی فتنہ کے استیصال میں مصروف رہا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے ایام میں ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی نے حضور کو مباہلہ کا چیلنج دیا اور لکھا کہ قطب مینار پر کھڑے ہو کر کندھے سے کندھا ملا کر چھلانگ لگائیں۔ پھر جو زندہ رہے اسے سچا سمجھا جائے۔ اسکے جواب میں خواجہ صاحب کو بتایا گیا کہ یہ مباہلہ کا طریق ان کا ایجاد کردہ ہے قرآن و حدیث کے خلاف ہے اور معقولیت سے دور، اگر وہ مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو صحیح طریق سے مباہلہ کریں۔ مگر چند ہی مضامین کے بعد خواجہ صاحب کی ترکی تمام ہو گئی۔ اور وہ خاموش ہو گئے۔

احرار کا فتنہ

احرار کا فتنہ اگرچہ آخر میں رونما ہوا مگر سب سے خطرناک اور زبردست تھا۔ وجہ یہ کہ اس وقت جماعت کافی ترقی کر چکی تھی اور سیاسی لحاظ سے بھی اچھا اثر اور رسوخ پیدا کر رہی تھی۔ جوں جوں ہندوستان میں بیداری پیدا ہو رہی تھی اور لوگ حکومت کے مقابلہ میں طاقت حاصل کر رہے تھے۔ نت نئے

مسائل کھڑے ہوتے رہتے تھے اور موقع محل کے مناسب جماعت احمدیہ ان کی صحیح
راہنمائی کرتی رہتی۔ سمجھدار طبقوں میں مقبولیت حاصل کر رہی تھی۔ ضرورت کے
وقت حکومت کو بھی صحیح مشورہ دیتے اور جائز مطالبات منظور کر لینے پر
زور دینے سے بھی دریغ نہ کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ انگریز افسروں کے غلط اور رعایا کو
دل آزار پہنچانے والے طریق عمل کے خلاف بھی معقولیت سے آواز اٹھائی جاتی
اور حکومت کو اس سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ ان حالات میں حکومت کے بعض اعلیٰ افسروں
کی آنکھوں میں جماعت احمدیہ کھٹکنے لگی اور انہوں نے ایسے دیسی افسروں کو اپنا آلہ
کار بنایا جو ذاتی مفادات کو ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے اور قومی و ملکی فوائد
ان کی نگاہ میں کچھ وقعت نہ رکھتے۔

اس کے ساتھ ان میں سے مسلمان کہلانے والوں کو جنہیں جماعت احمدیہ
سے مذہبی طور پر بھی عداوت اور دشمنی تھی اور جن کا کام ہی یہ تھا کہ ملک میں کوئی
نہ کوئی فتنہ پیدا رکھ کے اپنے عیش و آرام کا سامان مہیا کریں اور عوام کو اشتعال دلا کر
ان کی جیبیں خالی کراتے ہوئے اپنی جھولیاں بھریں۔ انہیں بھی افسران حکومت نے
اپنے ساتھ گانٹھ لیا اور انہیں جماعت احمدیہ کے خلاف شورش اور فتنہ پھیلانے
پر آمادہ کر لیا۔

پہلے پہل تو ان لوگوں نے معمولی اشتہارات کے ذریعہ چھیڑ چھاڑ
شروع کی اور کچھ مقامی لوگوں کو جو بہت ادنیٰ قسم کے مفلوک الحال تھے، کچھ مالی
امداد دے کر اور کچھ جھوٹے وعدے کر کے جماعت کے خلاف شکایات شائع کرنے
پر آمادہ کر لیا۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد قادیان میں احرار کانفرنس کرنے کا

اعلان کر دیا۔

جوں جوں کانفرنس کے منعقد کرنے کا مقررہ وقت قریب آتا گیا احرار کی شرارتیں بڑھتی گئیں۔ ان کے سرکردہ لوگ جو شرارت میں زیادہ ماہر تھے، قادیان آکر ڈیرہ ڈال بیٹھے تھے اور سرکاری افسر بھی انکی حمایت میں تھے اور جماعت احمدیہ کے خلاف اشتعال انگیزی، فتنہ پردازی اور بدزبانی کا شغل زوروں پر تھا اور جماعت احمدیہ جیسی پابند قانون اور حکام کی خیر خواہ جماعت کی دل آزاری کی جا رہی تھی، مگر ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ حکومت نے سب کچھ دیکھتے ہوئے اور احرار کی فتنہ انگیزی کو جانتے ہوئے اجازت دے دی۔ اور اس کے مقابلہ میں جماعت احمدیہ پر کئی ایک پابندیاں عائد کر دیں۔

احرار نے آریہ سکول میں جو قادیان کی حدود سے باہر موضع ننگل کی زمین میں عین قادیان کی سرحد پر واقع تھا اور تحصیلدار کی رہائش سے قریب ہی تھا، کانفرنس منعقد کی۔ جس میں دیگر مقررین کے علاوہ مولوی عطاء اللہ بخاری نے اس قدر بدزبانی و افترا پردازی۔ دروغ گوئی اور فتنہ انگیزی کی کہ خدا کی پناہ۔ پولیس اور موجودہ حکام نے سب کچھ بچشم خود دیکھا اور سنا۔ مگر ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ دورانِ کانفرنس میں احمدیوں پر کئی قسم کا تشدد کرتے رہے۔

کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد عطاء اللہ بخاری پر مقدمہ چلایا مگر یہ مقدمہ بھی دراصل جماعت احمدیہ کے خلاف سوچی سمجھی ہوئی سازش کی ایک کڑی تھی۔ مقدمہ چلنے پر سب سے پہلا سرکاری گواہ بنے۔ بعد ایڈیٹر الفضل پیش کیا گیا

میں نے سرکاری وکیل کے سوالات کے جواب میں اپنا بیان دیا اور عطاء اللہ بخاری کی تقریر کو نہایت دل آزار اور فتنہ انگیز قرار دیا۔ پھر دوبارہ مجھے شہادت کے لئے طلب کیا گیا اور مسلسل تین دن عطاء اللہ بخاری نے وکیل مظہر علی اظہر نے مجھ پر سوالات کئے اور میں جواب دیتا رہا۔ اس وقت تک ہر گز نے اس مقدمہ کو کوئی وقعت نہ دی۔ میں اکیلا ہی کورٹ میں جاتا اور سارا دن بیان لکھاتا رہتا جو سرکاری وکیل کے مختلف سوالات کے جواب میں ہوتا۔

اس موقعہ پر مجھے سرکاری وکیل کا جو ایک ہندو تھا اور مجسٹریٹ صاحب کا کہ وہ بھی ہندو تھا اور دیوان سنگو آنند [سکھ آنند] ان کا نام تھا، شکر گزار ہونا چاہیئے کہ بعض اوقات وہ میرے لئے کچھ نہ کچھ آسانی کی صورت پیدا کر دیتے اور میں جواب کا موقعہ پا لیتا۔ اگرچہ میرے لئے کورٹ میں اتنی لمبی شہادت دینے کا یہ پہلا موقعہ تھا، اور میں کسی قسم کا مشورہ دینے یا کوئی امداد حاصل کرنے سے بھی محروم تھا۔ لیکن خدا تعالےٰ کے فضل سے شہادت نہایت کامیاب اور مدلل ہوئی۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ جب مقدمہ سیشن جج کے سامنے گیا جو نہایت متعصب ہندو اور جماعت احمدیہ سے کافی بغض و کینہ رکھتا تھا تو وہ بھی میری شہادت میں سے کوئی ایک لفظ بھی مخالفانہ استدلال کرنے اور اپنی رائے کو درست ثابت کرنے کے لئے نہ پا سکا۔

آخر اس مقدمہ میں حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالےٰ کی بھی شہادت ہوئی اور دو دن ہوئی۔ اس وقت تک مقدمہ کافی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ حضور کے تشریف لیجانے پر سینکڑوں اصحاب قادیان اور دیگر مقامات سے

پہنچ جاتے۔ چوہدری ظفراللہ خانصاحب بھی تشریف لاتے، ان کا ذکر میں نے خاص طور پر اس لئے کیا کہ حضور سے ان کے اخلاص محبت اور انکسار کا تھوڑا سا نظارہ دکھانا ہے۔

اس وقت وائسرائے کی کونسل میں انکے تقرر کا اعلان ہو چکا تھا مگر ابھی تشریف نہ لے گئے تھے۔ کچہری کے احاطہ میں لوگ بکثرت ان کو دیکھنے کیلئے آتے اور انہیں آکر جس حالت میں دیکھتے وہ یہ ہوتی تھی کہ کار میں سے اتر کر حضور کے اترنے کے لئے دروازہ کھولتے۔ اگر کچہری میں ہوتے میں کچھ وقفہ ہوتا تو ایک پاؤں پائیدان پر رکھ کر حضور کی طرف جھکے رہتے۔ جب حضور کچہری میں جاتے تو بعض دوسرے احباب کی طرح آپ بھی اندر تشریف لے جاتے اور سارا وقت جو کئی گھنٹوں پر مشتمل ہوتا چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے، البتہ دو نو دن ایک آدھ منٹ بولے۔ ایک دن کا تو مجھے یاد نہ رہا کیا فرمایا مگر دوسرے دن جب وکیل مخالف نے پوچھا:۔

کیا چوہدری ظفراللہ خان کو آپ کی جماعت کی خدمات کے صلہ میں حکومت نے کونسل کا ممبر بنایا ہے؟

تو بجلی کی طرح تڑپ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا:۔

یہ غلط ہے! بالکل غلط! حکومت نے اپنی ضرورت کے لئے بنایا ہے۔

اور پھر بیٹھ گئے۔ مخالف وکیل چیختا رہ گیا کہ چوہدری صاحب کو بولنے کا حق نہیں ہے مگر چوہدری صاحب نے کوئی پرواہ نہ کی۔

اس مقدمہ میں لمبی چوڑی شہادتیں ہوئیں۔ حکومت نے چُن چُن کر ایسے گواہ بھی رکھے جو سلسلہ کے مخالف تھے اور جنہوں نے جو کچھ انکو سکھایا طوطے کی طرح رٹ دیا۔ غلط اور جھوٹ جو کچھ ان کے منہ میں آیا۔ کہا آخر مجسٹریٹ نے عطاء اللہ بخاری کو مجرم قرار دے کر تین ماہ کی قید کا فیصلہ دیا اور سیشن جج مسٹر کھوسلہ نے فوراً ضمانت منظور کر کے رہا کر دیا۔ اس کے بعد جب اپیل کی سماعت ہوئی تو مسٹر کھوسلہ نے جرم قائم رکھا مگر تا برخاست عدالت کی سزا دی۔ مگر فیصلہ میں قانونی حدود کو پھلانگ کر جماعت احمدیہ کے خلاف انتہائی بغض اور کینہ کا اظہار کیا۔ اور نہایت دل آزار الفاظ استعمال کیے اور سراسر غلط نتائج نکالے۔ اس کے خلاف ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا اور اس کے ناجائز ناروا اور بے ہودہ ریمارکس کو رد کر دیا۔

دینی تعلیم کی تکمیل

قادیان میں گو دینی تعلیم کا باقاعدہ انتظام نہ ہوا مگر یہ خدا تعالیٰ کا فضل تھا کہ مجھے اچھے طور پر تعلیم پانے کے کافی مواقع ملتے رہے، اور کالج سے فارغ ہو کر الفضل میں کام کرنے کے دوران میں حتیٰ کہ ایڈیٹر بن جانے کے وقت تک بھی کئی ایک بزرگوں سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ انکے اسماء حسب ذیل ہے :-

۱۔ صوفی غلام محمد صاحب، ۲۔ حضرت میر محمد اسحاق صاحب،
۳۔ مولانا سید سرور شاہ صاحب، ۴۔ حضرت قاضی امیر حسین صاحب

بیان کرکے حضور کو ضروری اور اہم حالات سے آگاہ کرنیکی کوشش کرتا۔ اور یہ سلسلہ میں نے حضور کے قادیان سے روانہ ہونے سے لے کر واپسی کے اس وقت تک جاری رکھا جبتک حضور نے قادیان کی ڈاک قادیان میں ہی رکھنے کا ارشاد نہ فرمادیا۔

حضور کی قادیان میں بخیر و عافیت واپسی بڑی ہی مسرت اور خوشی کا موجب ہوئی، اور اہل قادیان نے اس موقعہ پر اپنی خوشی اور مسرت کے اظہار میں کمال کر دیا حضور کی باتیں سننے اور قریب تر ہو کر زیارت کرنے کیلئے مردوں، عورتوں اور نوجوانوں نے متعدد پارٹیاں بنالیں، تاکہ حضور کو اپنی اپنی مجلس میں تشریف لانیکی دعوت دے سکیں اور ایک ایک دن میں چار چار پارٹیوں کی دعوتیں حضور منظور فرمانے لگے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ اور نہ معلوم کب تک جاری رہتا اگر حضور یہ نہ فرما دیتے کہ اس طرح کام کا حرج ہو رہا ہے، اس سلسلہ کو بند کرنا چاہیئے۔ آخر کئی کئی پارٹیوں نے مل کر دعوت کا اہتمام شروع کیا اور اس طرح یہ سلسلہ اختتام کو جا پہنچا۔ اس سلسلہ میں ایڈیٹر لند نے بھی ایک دعوت دی جن کی تعداد پانچ سات سے زیادہ نہ تھی۔ اس پارٹی کا سارا اہتمام حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے فرمایا۔ ایڈریس بھی انہوں نے ہی لکھا جو حضرت میر قاسم علی صاحب نے پڑھ کر سنایا، اور خوبصورت فریم میں لگا کر پیش کیا۔ اس میں الفضل کی خدمات کا جو اس نے حضور کے سفر کے دوران میں انجام دیں، بڑے شاندار الفاظ میں ذکر کیا گیا۔

ایڈریس کے جواب میں حضور نے تقریر فرماتے ہوئے احمدیہ پریس اور خاص کر الفضل کا ذکر بڑے اچھے رنگ میں فرمایا۔ نیز فرمایا کہ :-

سفر کے دوران میں مجھے جس وقت ڈاک ملتی تو میں سب سے پہلے قادیان کے خطوط چھانٹ لیتا، تو پھر قادیان کے خطوط میں سے دو آدمیوں کے خطوط الگ کر لیتا اور ان کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھول کر پڑھتا۔ یہ خط ایک تو غلام نبی ایڈیٹر الفضل کا ہوتا اور دوسرا قاضی اکمل صاحب کا۔ جو مجھے جماعت کے مفصل حالات سے باقاعدہ اطلاع دیتے۔ اور مخالفین کی مخالف کارروائیوں سے آگاہ کرتے۔

حضور نے ولایت سے واپس تشریف لانے پر مجھے ایک خوبصورت شیشہ کا قلمدان بطور تحفہ عنایت فرمایا۔ جو آخر میں اپنی بچی کنیز احمد کو جو اسی سال پیدا ہوئی تھی جس سال حضور ولایت تشریف لے گئے، بطور جہیز دیا۔ اور الحمد للہ کہ آج تک وہ قلمدان اس کے پاس اس احتیاط کے ساتھ محفوظ ہے کہ گویا آج ہی خریدا گیا ہے۔

جب اس بات کا پتہ بھائی صاحب موصوف کو لگا تو انہوں نے

حضرت امیر مقامی کی خدمت میں لکھا کہ :-

میں جو کچھ لکھتا ہوں آپکی اور مقامی جماعت کی اطلاع اور دل آپکیا
کے لئے لکھتا ہوں اخبار کے لئے نہیں لکھتا اور نہ اخبار کے لکھنے کے لئے مجھے
فرصت ہے ۔ بہت بڑی افراتفری میں اُلٹا سیدھا لکھتا چلا جاتا ہوں ۔ اور جب
ڈاک میں ڈالنے کا موقعہ ملتا ہے بغیر نظر ثانی کئے ڈال دیتا ہوں ۔ بعض اوقات
نہایت ضروری اور اہم بات لکھنے لگتا ہوں لیکن کوئی ضروری کام آ پڑتا ہے
تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے سرانجام دینے کے لئے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں
بات درمیان میں ہی رہ جاتی ہے ۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ادھر ادھر
بھاگنا دوڑنا پڑتا ہے تاہم جو کچھ اور جس طرح بھی ہو سکتا ہے مقامی احباب
کی خاطر کرتا جا رہا ہوں ۔ آپ جو مناسب سمجھیں سنائیں ۔ میں کسی بات کی ذمہ داری
لینے کے لئے تیار نہیں اور اخبار میں شائع کرنے کی صورت میں تو مجھ پر
کوئی ذمہ داری عائد ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ میں اخبار کو کچھ بھیج ہی نہیں رہا

اس پر حضرت مولوی صاحب نے مجھے ارشاد فرمایا کہ

بھائی جی کے خطوط اس شرط پر آپکو دیئے جاتے ہیں کہ انکی بنا پر
جو کچھ تم شائع کروگے اس کی ساری ذمہ داری تم پر عائد ہوگی ۔ ہم اپنی ذمہ داری
پر یہ کام سرانجام دیا اور یہ نوٹ کر لو کہ اگر آپ نے کوئی ایسی بات شائع کردی جو
ناقابل اشاعت سمجھی گئی تو اس کی جوابدہی تمہیں کرنی ہوگی اور اگر کوئی
ایسی بات شائع نہ کی جو قابل اشاعت سمجھی گئی تو بھی تم سے جواب طلبی کیجائیگی

میں نے یہ بات فوراً منظور کر لی کہ جماعت حضور کے ایک ایک لمحہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے مضطرب تھی اور چاہتی تھی کہ ایک پل بھی ایسا نہ گزرنے جبکہ یہ معلوم نہ ہو کہ اس وقت حضور کس کیفیت میں تھے، اور کیا کر رہے تھے۔ پھر یہ حقیقت تھی کہ بھائی جی کے خطوط پڑھ کر مجھے بھی لطف آجاتا، دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی اور اکثر اوقات تو وجد کی سی حالت ہو جاتی ۔ ان حالات میں میں نے ایک لمحہ توقف کے بغیر یہی فیصلہ کیا کہ اگر کوئی فروگذاشت بھی کی گئی اور اس پر سزا بھی مل گئی تو پروا نہیں ۔ اس خطرہ کی وجہ سے جماعت کو ان حالات اور کوائف سے محروم نہیں رکھا جا سکتا جو محض خدا تعالیٰ کے فضل سے مہیا ہو رہے ہیں۔ اگر وہ تفضل کے لئے نہیں لکھے جاتے تو نہ سہی، اگر انکی اشاعت کی ذمہ واری نہیں لی جاتی تو نہ سہی لیکن حاصل تو ہو رہے ہیں ان سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔

ان وجوہ سے یہ ذمہ واری میں نے بخوشی اٹھا لی جبکہ کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ تھا کہ مجھے اس بارے میں مشورہ ہی دے سکے مبادا کہ ذمہ واری ان پر بھی آپڑے اور وہ بھی کسی گرفت میں آجائیں ۔ مگر خدا تعالیٰ کا بڑا ہی احسان و شکر ہے کہ اس بارے میں کوئی فروگذاشت قابل گرفت نہ پائی گئی اور حضور نے ایڈیٹر دل کی طرف سے دعوت کے موقعہ پر بڑی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔

ایک فروگذاشت

فروگذاشت کا ذکر آگیا ہے تو میں اس موقعہ پر ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کر دوں۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی ڈائری کے سلسلہ میں ایک دن میرے اسسٹنٹ نے حضور کے ملفوظات قلمبند کئے اور میں نے معمولی کمی بیشی کے بعد درج اخبار کر دیئے۔ حضور کے پاس جب اخبار چھپ کر پہنچا تو حضور نے ایک فقرہ ناپسند فرمایا اور فرمایا کہ اس اخبار کو روک دیا جائے اور یہ ورق تصحیح کے بعد دوبارہ چھاپا جائے، اور سارا خرچ ایڈیٹر پر ڈال دیا جائے۔

اُس وقت تک اخبار کے پیکٹ بن چکے تھے، ٹکٹیں لگ چکی تھیں، اور اخبار ڈاک خانہ میں جانے کیلئے تیار تھا، اخبار روک دیا گیا اور دوبارہ چھاپ کر بھیجدیا گیا۔ مینیجر الفضل نے اس تبدیلی کا خرچ چار سو روپیہ تجویز کیا۔ رپورٹ صدر انجمن میں بھیجدی گئی اور انجمن نے یہ رقم میرے ذمہ ڈال دی۔ جس پر میں نے ایک طرف تو انجمن میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی اور وجوہات اس قسم کی لکھیں:

ا۔ میرے لئے اس قسم کا کوئی انتظام نہیں کہ میں ضرورت کے وقت کسی اہم معاملہ میں کسی ذمہ دار ہستی سے مشورہ تک لے سکوں۔

۲۔ اخبار کو چیک کرنے کا کوئی ایسا انتظام نہیں کہ وہ ایسے وقت چیک کیا جائے جبکہ کم از کم خرچ برداشت کرنا پڑے۔ موجودہ واقعہ میں اخبار کو روکنے کا حکم بالکل آخری وقت دیا گیا اس لئے ٹکٹوں کا خرچ مجھ پر ڈال دیا گیا جو بڑا کافی تھا۔ اور اگر اخبار ڈاکخانہ میں چلا جاتا . . . . . .

اور وہاں سے واپس لینا پڑتا تو اور بھی بہت زیادہ خرچ برداشت
کرنا پڑتا اور وہ بھی مجھ پر ڈالا جاتا۔ اور اگر اخبار پوسٹ ہو چکا ہوتا تو پھر اخبار کو
روکنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ اس وقت اگر وہ خطرہ پیش آجاتا جس کے پیش
آنے کا اندیشہ تھا تو پھر بے حد خرچ برداشت کرنا پڑتا، تو وہ تو میں سب کچھ
دے کر بھی برداشت کرنے کے قابل نہ ہوتا۔ پس بروقت اخبار کو چیک کرنے کا
انتظام کیا جائے۔

اور دوسری طرف یہ درخواست کی کہ جو کچھ اخبار میں شائع ہو اور اس کے لئے سنسر
مقرر کر دیا جائے، وہ دیکھ کر اشاعت کی اجازت دے اور ساری ذمہ داری
اس پر ہو۔

۳۔ عملہ میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ اگر سنسر کسی مضمون کی اشاعت
روک دے تو اس کی بجائے کوئی اور مضمون تیار کر کے بروقت اس کے سامنے پیش
کیا جا سکے۔

صدر انجمن نے اس پر یہ فیصلہ کیا کہ رقم کو کم کر کے صرف پچاس روپے
کر دی اور ایک کمیٹی مشتمل بر حضرت مرزا بشیر احمد صاحب، حضرت میر محمد اسحق صاحب
اور شیخ عبد الرحمن صاحب مصری تجویز کر دی۔ جو مضامین پاس کیا کرے۔

یہ فیصلہ جب حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچا تو آپ نے
اس میں یہ ترمیم فرما دی کہ ڈائری چونکہ اسسٹنٹ نے لکھی تھی، اور ایڈیٹر اگرچہ اس
کی ذمہ داری سے بری تو نہیں ہو سکتا لیکن اسسٹنٹ پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اسے
بھی احتیاط کرنی چاہیئے تھی، اس لئے پچاس روپیہ کی رقم دونوں پر نصف نصف ڈالی

چاہیئے۔ باقی اخبار کے مضامین چیک کرنے اور اُنکی ساری ذمہ داری کمیٹی پر ڈالنے کے کوئی معنے نہیں۔ اس طرح ایک طرف تو اخبار چلانے میں مشکلات پیش آئیں گی دوسرے تین مصروف آدمیوں کے لئے مضامین پاس کرنے کے لئے وقت نکالنا مشکل ہوگا۔ اس قسم کی کمیٹی قطعاً نہیں ہونی چاہیئے۔ ساری ذمہ داری بدستور ایڈیٹر پر ہونی چاہیئے۔

چونکہ اخبار کے کام کے لحاظ سے یہی فیصلہ درست اور صحیح تھا اس لئے یہی جاری ہوا۔ اور میں نے خدا تعالیٰ کا شکر کیا کہ میں نے اپنی نادانی سے اپنے لئے خود جو پابندیاں عائد کرانی چاہی تھیں اور ان پر عمل کرنا میرے لئے نہایت دشوار اور بہت مشکلات کا باعث تھا اسے حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نوازش سے نامنظور فرمایا۔

ایک اور موقعہ پر جبکہ احرار کی فتنہ انگیزیاں حد سے بڑھ چکی تھیں اور ضلع کے حکام جماعت کو نقصان پہنچانے اور تنگ کرنے کیلئے طرح طرح کی شرارتیں کر رہے تھے۔ خاص کر ہیڈ ڈپٹی کمشنر کئی قسم کی ناانصافیوں اور بے جا حرکات کا مرتکب ہو رہا تھا۔ ناظر صاحب امور عامہ نے جو ان دنوں غالباً مولوی فرزند علی صاحب تھے، مجھے ان کے خلاف مضامین لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے یہ سلسلہ شروع کر دیا اور اس سلسلہ کا پہلا مضمون لکھ کر ناظر صاحب موصوف کو دکھا لیا اور شائع کر دیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جس دن یہ مضمون شائع ہوا تھا ناظر صاحب اس دن کسی سلسلہ کے کام کے لئے قادیان سے باہر جا چکے تھے۔

اسی دن جب اخبار حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں

پہنچا تو حضور نے مجھے اپنی خدمت میں طلب فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ مضمون ناظر صاحب امور عامہ کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بنا پر لکھا ہے اور لکھنے کے بعد انکو دکھا کر شائع کیا ہے۔

حضور نے فرمایا۔ ناظر امور عامہ کو اخباری اختیاطوں اور قانونی گرفتوں کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ ان باتوں کا تم کو خیال رکھنا چاہیئے۔ تاہم فرمایا، ناظر امور عامہ کو بلا لاؤ۔ میں گیا اور معلوم ہوا کہ خانصاحب تو یہاں نہیں ہیں۔ انکی بجائے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب قائم مقام ناظر امور عامہ ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو ساتھ لیکر سیڑھیوں میں پہنچا۔ حضور نے ان سے اس خطرہ کا اظہار فرمایا جو مضمون سے پیدا ہو سکتا تھا۔

خدا تعالیٰ حضرت میاں صاحب پر اپنے بڑے بڑے برکات نازل فرمائے اور ہمیشہ اپنے فضلوں کے سایہ میں رکھے۔ انہوں نے نہایت احسن طریق سے اس وقت میری مشکل آسان کرنے کی کوشش فرمائی۔ اور چند ہی منٹوں کے اندر اندر خدا تعالیٰ نے انکی سعی کو قبولیت کا شرف بخشا۔

اس مضمون کا دوسرا حصہ میں نے ایک دو دن بعد شائع کیا۔ وہ مضمون جب حضور کی خدمت میں پہنچا اور حضور نے ملاحظہ فرمایا تو مجھے ارشاد فرمایا، مضمون میں نے پڑھا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں جان نہیں ہے۔ جواب میں میں کیا عرض کر سکتا تھا۔ میں خود سمجھتا تھا کہ واقعی مضمون میں جان نہیں ہے۔

رنج و الم کے لمحات

اخبار نویسی کے دوران خدا تعالیٰ کے فضل سے خوشی اور مسرت کی گھڑیاں بھی بڑی کثرت سے آئیں۔ اور عموماً خوشی اور مسرت کا ہی دور دورہ رہا لیکن بتقاضائے بشریت غم و حزن اور رنج و الم کے لمحات بھی بعض اوقات آئے اور خدا تعالیٰ نے صبر و شکر کے ساتھ ان کو گزارنے کی توفیق بخشی۔ ایسا بھی ہوا کہ دفتر میں بیٹھے ہوئے اخبار نویسی کے کام میں بے حد مصروفیت کے وقت نہایت ہی رنج و الم کی خبر پہنچی، آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دل حزن اور ملال سے بھر گیا۔ دماغ سوچنے سے معذور ہو گیا۔ ہاتھ لکھنے سے جواب دے گئے، اور میں نے تھوڑی دیر کے لئے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ جب کاتبوں نے مضمون حاصل کرنے کے لئے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا تو آنسو پونچھ کر اور دل مضبوط کر کے میں نے دروازہ کھول دیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ جب فارغ ہو گیا تو پھر دروازہ بند کر لیا اور غم و الم کو نکلنے کے لئے راستہ دے دیا۔ اس طرح اپنے فرض کو ادا کرتا رہا، اور رنج و ملال کو برداشت کرتا رہا۔

جب میرے پیارے۔ اکیلے نوعمر اور نوجوان سعید بھائی غلام رسول کی خبر مجھے پہنچی تو میرے رنج و الم کی انتہا نہ رہی۔ دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ غربت میں (یعنی غریب الوطنی میں۔ ناقل) ہانگ کانگ اسکی

وفات کا خیال کر کے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ قریبًا ایک گھنٹہ کے اندر اندر میں ارادہ کر کے کام کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو گیا تھا البتہ معمول سے کچھ دیر قبل گھر چلا گیا۔ اس پر عورتوں کو بھی تعجب ہوا اور جب وجہ بتائی گئی تو وہ بھی میرے ساتھ رونے دھونے میں مصروف ہو گئے۔

میرے نہایت پیارے چار بچے تھے۔ تین بچپن میں اور ایک جوان ہو کر فوت ہوئے۔ اور اس بات کا حقیقی احساس مجھے پہلے بچے کے فوت ہونے پر ہی ہوا کہ ماں باپ کو چھوٹے سے بچے کے فوت ہونے پر بھی بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ لیکن ایسی حالت میں بھی خدا تعالیٰ نے مجھے باقاعدہ کام کرنے کی ہمت بخشی، اور ایسے موقعہ پر بھی میں نے شاید ہی ایک آدھ دن کی نامکمل سی رخصت لی۔ نامکمل اس طرح کہ ایسی حالت میں بھی مجھے اپنے کام کا خیال رہتا، اور ضروری امور کے سرانجام دینے میں حصہ لیتا۔

تیمارداری تو مجھے کسی کی بھی کرنے کی توفیق نہ ملی۔ میرا ایک نہایت پیارا بچہ پانچ چھ سال کی عمر کا جو تمام پیدا ہوا تھا، اور جس کی پرورش میں اس کی ماں اور دیگر رشتہ داروں نے بڑی شفقت دکھائی تھی، اچھا بھلا کھیلتا کودتا ایک دن بیمار ہو گیا اور تیسرے دن چل بسا۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ؎

مجھے دفتر میں اس وقت اطلاع ملی جب وہ آخری لمحوں پر تھا۔ اسی طرح والدہ ماجدہ بھی اچانک پیٹ کے درد سے بیمار ہوئیں۔ اگرچہ انہوں نے بیمار ہوتے ہی کہہ دیا تھا کہ میں نہیں بچوں گی۔ مگر ہم نے معمولی بات سمجھی مگر

مگر تیسرے دن رات کو جب دفتر سے آکر میں نے انکو دیکھا تو ان کی آخری سانس لے رہی تھی اور اسی رات فوت ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؁

پہلی بیوی کے ہاں جب تمام بچے پیدا ہوئے تھا انکی صحت بہت کمزور تھی۔ بچے بھی اتنے ضعیف اور کمزور تھے کہ صرف ہڈی چمڑے کا ڈھانچہ نظر آتے تھے۔ پیدائش کے ساتھ ہی انکو اوپر کا دودھ دینے کے سوا چارا نہ تھا۔ انکی دیکھ بھال کا اتنا بوجھ تھا جو کمزور اور بیمار ماں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ گھر میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ ہم نے اپنے وطن سے ایک چھوٹی سی لڑکی منگا لی، لیکن وہ بھی آخر بچی تھی۔ مجھے سارا دن اور رات کا کچھ حصہ بھی دفتر میں رہنا پڑتا۔

یہ ایام میری بیوی کے لئے نہایت مشقت اور محنت کے تھے۔ دو ڈھائی سال کی ایک بچی کنیز احمد بھی ابھی دیکھ بھال کی محتاج تھی۔ آخر ہم نے یہ صورت اختیار کی کہ کھانے پکانے کو تو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ اچھا بُرا، کچا پکا جو کچھ بھی میسر ہو جاتا تا شکر کے ساتھ کھا پی لیا جاتا۔ رات کو سردیوں کے موسم میں اپنا کام لے کر بچوں کی چارپائی کے پاس بیٹھ جاتا اور بارہ ایک بجے تک بیٹھ کر کام بھی کرتا، اور جب ضرورت ہوتی بچوں کو بھی سنبھالتا۔ دودھ گرم کرکے اور دوائی ملا کر اور بار بار چوسنی صاف کرکے انکو پلاتا۔ اس کے بعد پھر کہ بیوی جاگ پڑتی اور پھر صبح تک وہ یہ ڈیوٹی ادا کرتی۔ دن میں میرا صرف یہی کام تھا، اور اس کے لئے بھی بڑی مشکل سے وقت نکالتا۔ کہ سائیکل پر گھر آتا، بچوں کو تسلی دینے کی کوشش کرتا اور پھر دفتر پہنچ جاتا۔ آخر خدا تعالیٰ نے ہماری محنت

قبول فرمائی، اور دونوں بچے خدا تعالیٰ کے فضل سے بڑی اچھی صحت کے ساتھ پل گئے اب خدا تعالیٰ کے فضل سے جوان ہیں۔ حمیدہ احمد اور مجیدہ احمد ان کے نام ہیں۔

مصروفیات میں اضافہ

احرار کے فتنہ کے آغاز میں جب حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے الفضل کو دو روزہ کی بجائے روزانہ شائع کرنے کا ارشاد فرمایا، تو الفضل کی مینجری اور پریس کی مینجری کا کام بھی میرے سپرد فرمایا۔ الفضل کے روزانہ ہونے کی صورت میں اخبار کے کام میں ہی بہت اضافہ ہوچکا تھا۔ کم از کم دوگنا کام ہو جانے میں تو کوئی شک ہی نہ تھا۔ لیکن دراصل کام میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ روزانہ کے لحاظ سے ہر قابل اشاعت چیز جلد سے جلد شائع کرنا ضروری تھا۔ اور خدا تعالیٰ نے یہاں تک توفیق بخشی کہ عام طور پر آج کی مفصل تقریر یا کم از کم اس کا خلاصہ صبح کی اخبار میں چھاپ دیا جاتا۔ اور حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی ڈائری جبکہ آپ مغرب کے بعد عشاء تک مجلس فرماتے۔ اس کا خلاصہ عشاء کی نماز کے بعد مرتب کر کے اسی وقت درج اخبار کر دیا جاتا، اور اخبار صبح کی نماز کے وقت احباب کی خدمت میں پہنچا دیا جاتا۔ اس سے روزانہ اخبار کے کام میں اضافہ کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا تھا۔

پریس کی مینجری کا کام بھی کافی سرگرمی اور مشقت چاہتا تھا۔ اول تو اپنا پریس لگانے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ سابقہ پریس ناکافی

دوسرے صدر انجمن خود پریس کی مشینری خریدنے کو تیار نہ تھی (کیونکہ الفضل تجارتی صیغہ نہ تھا، اور تجارتی صیغے کمپنی اور ادارے یعنی ریویو آف ریلیجنز اردو۔ مصباح۔ پریس، سن رائز اپنی آمدنی کافی نہ رکھنے کی وجہ سے الفضل کی آمد پر چلتے تھے۔ مشینری خریدنے کی گنجائش نہ تھی)، اس لئے ٹھیکہ پر ہی سے کام کراتا تھا اور خدا تعالیٰ نے یہ کام کرا دیا۔ پھر اخبار کی مینیجری کا کام بھی بڑھ گیا۔ مگر ان اضافوں کے باوجود جن میں کچھ عرصہ کے بعد مصباح کی ایڈیٹری اور مینیجری کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ صرف بالکل نوآموز اسسٹنٹ مجھے دیا گیا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل نے مجھے مشکل سے مشکل حالات میں بھی ان سب فرائض کو ادا کرنے کی توفیق بخشی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اور میں نے آخر وقت تک یہ کام اسی تنخواہ میں کیا جو میری بطور ایڈیٹر الفضل مقرر تھی۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ ہوا اور وہ یہ کہ نظارت دعوت و تبلیغ نے مطبع کا کام الفضل سے الگ کر کے صیغہ نشر و اشاعت کے انچارج کے سپرد کر دیا۔ الفضل کی طباعت کا بھی اسے ذمہ وار قرار دے دیا۔ انہی ایام میں حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کا ایک نہایت طویل اور مفصل خطبہ جمعہ ڈلہوزی سے موصول ہوا، جو حجماً اخبار کے ۲۳ صفحات پر آیا۔

عام اخبار آٹھ صفحہ کا ہوتا تھا۔ یہ تین گنا اخبار بھی ایک دو دنوں میں ہی تیار کرنا تھا۔ دن رات ایک کر کے کاپیاں تیار کیں۔ لیکن جب پریس میں بھیجیں تو چھاپتے وقت پریس والوں سے بعض الفاظ بگڑ گئے۔

یہ پرچہ جب حضور کی خدمت میں پہنچا تو حضور نے دیکھ کر سخت

ناراض ہوئے۔ اس وقت اتفاقاً میرے ایک خاص مہربان دوست موجود تھے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہدیا کہ حضور پرچہ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ میں جو حصہ زیادہ اہم اور ضروری تھا اسے جان بُوجھ کر بگاڑا گیا ہے۔ حضور نے ناظر دعوت و تبلیغ کو لکھا کہ مینیجر کو خاص طور پر سزا دی جائے اور مینیجری کا کام موجودہ مینیجر سے لے لیا جائے۔

صدر انجمن نے فیصلہ کیا کہ مینیجری کے کام سے مجھے فارغ کر دیا جائے، اور سالانہ ترقی جو حال میں ہوئی ہے وہ روک لی جائے، اور دو سال تک ترقی بند کر دی جائے۔

اس پر میں نے اپیل کی کہ مینیجری کے کام سے فارغ کرنے کا تو بہت بہت شکریہ! مگر یہ [illegible] ہے کہ جس مینیجری کا مجھے کئی سال تک ایک حبہ بھی معاوضہ نہ دیا گیا، اور مفت کام لیا جاتا رہا۔ اس سے اس لئے فارغ کرتے ہوئے کہ ایک پرچہ کی لکھائی چھپائی اچھی نہ ہوئی میری ایڈیٹری کی تنخواہ کی ترقی روک دی گئی۔ مہربانی فرما کر اتنے سال مفت کام کرنے کے صلہ میں ایک پرچہ کا نقص نظرانداز فرما دیا جائے۔

یہ بات انجمن کی سمجھ میں معقول معلوم ہوئی، اور اس نے عائد کردہ سزا منسوخ کر دی۔

جماعت کے بزرگ اور سرکردہ احباب ہمیشہ نہایت قیمتی مضامین خود بخود رقم فرما کر اور بعض اوقات میری درخواست پر بھی عنایت فرماتے تھے کہ خاندان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خواتین مبارکہ

بھی الفضل کے خاص نمبروں کے لئے بہترین مضامین لکھ کر عنایت فرماتی رہیں۔
اگر کسی مضمون کی اشاعت میں کوئی کوتاہی ہو گئی تو اسے بھی نظر انداز کر دیا
جاتا۔ اور کبھی کوئی شکائت کا رنگ پیدا نہ ہوتا۔

میں نے خدا تعالیٰ کے فضل سے قادیان میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۷ء
تک زندگی بسر کی، اور نہائت کس مپرسی سے شروع ہو کر اس حد تک پہنچا۔
جبکہ قادیان کی ہر تقریب، ہر دعوت، ہر مجلس اور ہر اجتماع میں
مجھے شمولیت کا اعزاز عطا کیا جاتا۔ تمام معززین اور سرکردہ احباب سے
خصوصاً اور عام پبلک سے عموماً واسطہ تھا۔

ان ایام میں جبکہ حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ
اللہ تعالیٰ نے مغرب کی نماز کے بعد عشاء کی نماز تک مسجد میں مجلس فرمانی شروع
کی جس میں حقائق اور معارف بیان فرماتے تو میں نے "مجلس عرفان"
کے عنوان سے ان حقائق کو الفضل میں شائع کرنے کا انتظام شروع کیا۔ اس
کام کے لئے اپنے اسسٹنٹوں کو باری باری بھیجتا لیکن چند روز کے بعد میں نے
یہ ذمہ داری بھی خود اٹھا لی۔ پہلے ایک دن کی ڈائری مرتب کر کے اسی دن کے
اخبار لکھایا جاتا، اس میں دیر ہو جاتی تھی۔ بعد میں یہ پابندی عائد ہو گئی کہ
شام کی ڈائری صبح کے اخبار میں لازماً شائع ہو جانی چاہئے۔ چنانچہ میں
ساڑھے نو بجے مجلس ختم ہونے پر دفتر میں آ کر ڈائری لکھتا اور اسی وقت
اخبار میں لکھا کر صبح سویرے شائع ہونے والے اخبار میں شائع کر دیتا
اور یہ سلسلہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔

میری صحت خراب ہونے کی وجہ سے مجھے رخصت لینی پڑی، صدر انجمن نے جس قدر مجھے رخصت کا حق تھا دے کر پنشن منظور کر لی۔ اور پوری پنشن یعنی نصف تنخواہ منظور کی۔ میری رخصت کی میعاد ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ انقلاب آگیا اور "داغ ہجرت" کے الہام الٰہی کے مطابق قادیان چھوڑنا پڑا۔

تمت بالخیر

آپکی تصنیفات

ایک نئی تحقیقات، انبیاء کی شان از روئے بائبل و قرآن، اگست سنہ ۱۹۱۶ء

اسلام میں مجددین ———— سنہ ۱۹۱۹ء

پنڈت لیکھرام کی پیشگوئی ———— سنہ ۱۹۱۹ء

حرفِ آخر

یہاں پر کتاب "چھتیس سال قادیان میں" سوانح حیات حضرت خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم ختم ہوتی ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ مرحوم کے خود نوشت حالات جوں کے توں احباب جماعت تک پہنچ جائیں۔ بھول چوک کے لئے ہم خدا تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہیں۔ اگرچہ انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد بھی مرحوم پاکستان میں آکر کئی سال کھاریاں ضلع گجرات میں مقیم رہے مگر ہم نے مرحوم کی اپنی خواہش کے مطابق ان کی قادیان کی زندگی ہی کی روئداد پیش کی ہے تاکہ قارئین کرام اس روئداد کو پڑھ کر قادیان کے دینی ماحول سے روشناس ہو سکیں۔ امید ہے کہ دوست ان حالات سے کئی قسم کے فوائد حاصل کر سکیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ایسا ہی کرے اور اس کتاب کو بہتوں کے لیے باعثِ نصیحت و ہدایت بنائے، اور ہمیں بھی ان کے اجر و ثواب میں شامل کرے۔ آمین ثم آمین، یا ربّ العالمین۔

میں مکرم مولوی مبشر احمد صاحب راجیکی کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ان مسودات کو اول سے آخر تک

نہایت توجہ سے پڑھا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اور
اس کتاب کو ہر طرح وقیع بنانے میں میرا ہاتھ بٹایا۔ جزاہم
اللہ احسن الجزاء۔

اس کتاب کی اشاعت کے جملہ اخراجات عزیزم
محمد منیر احمد صاحب (فریکفورٹ۔ مغربی جرمنی) ابن محترم
خواجہ صاحب مرحوم نے برداشت کئے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

محتاج دعا خاکسار

کیپٹن ملک خادم حسین عفی عنہ
۱۷/۳۴ فیکٹری ایریا ربوہ۔ پاکستان

([illegible] تحریر کرد)

وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

میرے والد بزرگوار

(از خواجہ منیر احمد صاحب حال فرینکفورٹ مغربی جرمنی)

میرے والد ماجد حضرت خواجہ غلام نبی صاحب رضی اللہ عنہ ایڈیٹر الفضل فالج کی بیماری میں ایک عرصہ بیمار رہ کر اپنے آبائی وطن گکھڑیاں [illegible] میں وفات پائی۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ خدا تعالےٰ والد ماجد کے درجات بلند فرمائے اور ان کو اپنے قرب میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

مرحوم بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ ہر چیز میں سادگی پسند فرماتے تھے، لباس ہمیشہ سادہ مگر صاف ستھرا ہوتا تھا۔ کھانے میں کبھی دو سالن استعمال نہ کرتے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لنگر خانہ کی بابرکت روٹی کھانے کی ہمیشہ خواہش رکھتے۔ باوجود دو بیویاں ہونے کے ہمیشہ گھر میں ایک ہی ہانڈی پکتی رہی اور آخر وقت تک یہی دستور رہا اور دونوں گھروں نے

ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ لڑائی جھگڑا اور شرارت انگیزی کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ہم بچوں کو جب کبھی باہر سے کوئی تکلیف یا پریشانی ہوتی، اور ہم آکر والد ماجد سے شکایت کرتے تو ہمیشہ درگزر سے کام لیتے، اور فریقین کا معاملہ خدا تعالیٰ پر چھوڑ دیتے اور دعا کرتے۔

نماز پڑھنے کی عادت بچپن سے وفات تک رہی۔ حتیٰ کہ جب فالج کی وجہ سے بالکل معذور ہوگئے اور چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تو لیٹے لیٹے اشاروں سے نماز پڑھتے کیونکہ زبان بھی مفلوج ہو چکی تھی مگر یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل تھا کہ وفات تک ظاہری صحت بہت اچھی رہی۔ ہوش و حواس قائم رہے، جسم بھی خوب تنا رہا چہرہ دیکھنے سے یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ آپ بیمار ہیں جب تک صحت مند رہے کبھی کوئی نماز ضائع نہیں ہوئی۔ اور خاص خوبی یہ تھی کہ تہجد گذار انسان تھے۔ اس کا علم مجھے یوں ہے کہ میں ایک لمبے عرصہ تک والد ماجد کے ساتھ سوتا رہا ہوں۔ حتیٰ کہ دس بارہ سال کی عمر میں بھی والد ماجد مجھے اپنے ساتھ سلاتے تھے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا میں نے ہمیشہ والد ماجد کو تہجد پڑھتے دیکھا۔ اس آہ و زاری اور سوز و گداز سے تہجد پڑھتے کہ میری آنکھ کھل جاتی، اور پھر تہجد ختم ہونے تک انکو دیکھتا رہتا اور ایک خاص سرور محسوس کرتا۔ والد ماجد دیر تک کھڑے رہ کر رو رو کر دعائیں مانگتے اور خدا تعالیٰ کے حضور بخشش اور خیر و برکت کی التجائیں کرتے پھر صبح کی نماز پڑھنے مسجد میں چلے جاتے۔

دوسری خاص خوبی یہ تھی کہ اپنے ماتحت عملہ اور گھر کے ملازمین کے ساتھ

انتہائی شفقت اور محبت سے پیش آتے۔ کبھی ان کو اپنے ساتھ شکار پر لیجاتے
اور کبھی نہر پر ٹرپ منانے کے لئے، اور وہاں خود سب کے ساتھ مل کر کھانا
پکاتے اور کھاتے، شام کو کھیل کود کر واپس آجاتے۔ گھر کے ملازمین کو کبھی
غصہ نہ ہوتے، بالکل اپنے بچوں جیسا سلوک کرتے، اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے
اور وہی لباس انکو پہناتے جو اپنے بچوں کو پہناتے۔ ہمیشہ یتیموں کو
اپنے گھر میں رکھتے اور جب جوان ہوجاتے تو ان کے لئے کام مہیا کرتے اور
پھر ساری عمر اپنے بچوں کی طرح ان کا خیال رکھتے۔ اکثر یتیموں اور لاوارثوں
کو اجتماعی صورتوں میں بھی بلا کر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے اور مالی امداد بھی
کرتے۔

سلسلہ کی طرف سے جو ان پہ ذمہ واری ڈالی جاتی اس کو اپنی جان
اور اولاد کی پرواہ کئے بغیر نبھاتے۔ رات دن ایک کر دیتے۔ اکثر ایسا ہوتا
کہ ہفتہ ہفتہ بھر والد ماجد کی شکل نہ دیکھتے۔ چھٹی کے دن سب کے ساتھ مل کر
بیٹھتے اور اپنی مصروفیات بیان کرتے اور خوش ہوتے۔

بچوں کی صحت اور تعلیم کا بہت شوق تھا، خود کو فرصت نہ ہونے
کی وجہ سے گھر میں دو دو ماسٹر رکھتے اور خوراک وغیرہ کا عمدہ انتظام کرتے۔
مہمان نوازی کا بہت شوق تھا۔ اپنے اساتذہ، مہربانوں اور بڑے بزرگوں
کی بہت عزت کرتے۔ گھر میں کبھی کوئی اچھی چیز پکتی تو انکو ضرور بھجواتے۔
جلسہ سالانہ کے ایام میں اور دوسرے دنوں میں بھی عزیزوں کو بلا کر یہاں رکھتے
اور حتی المقدور خاطر کرتے

والد ماجد کے مہربانوں، کرم فرماؤں اور بزرگوں کی تعداد بہت
زیادہ تھی جو والد ماجد کو بالکل ابتدائی ایام سے انتہائی پیار اور محبت
کی نظر سے دیکھتے تھے اور قدم قدم پر راہنمائی فرماتے تھے۔ ان بزرگوں
اور کرم فرماؤں میں حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ۔ حضرت
خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ، حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ، حضرت مرزا شریف احمد صاحبؓ، حضرت حافظ روشن علی صاحبؓ
حضرت میر محمد اسحاق صاحبؓ، حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحبؓ، حضرت مولوی
محمد دین صاحب، صدر صدر انجمن احمدیہ ربوہ، حضرت مرزا عزیز احمد صاحب ایم اے
ناظر اعلیٰ ربوہ۔ حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب سابق صدر [illegible]
اور سابق صدر عالمی عدالت دی ہیگ، حضرت مولانا غلام رسول
صاحبؓ راجیکی، حضرت صوفی غلام محمد صاحبؓ، حضرت مولوی فضل دین
صاحبؓ وکیل، خانصاحب مولوی ارجمند خان صاحبؓ، مولوی قمر الدین
حضرت مولانا سید محمد سرور شاہ صاحبؓ، حضرت قاضی امیر حسین صاحبؓ
اور حضرت میر قاسم علی صاحبؓ وغیرہم شامل تھے۔

تیسری خوبی ان کی یہ تھی کہ ہمیشہ حوصلہ اور درگذر سے کام
لیتے۔ تحمل کا مادہ آپ میں بہت پایا جاتا تھا۔ بڑی سے بڑی پریشانی
کا مردانہ وار مقابلہ کرتے۔ خدا تعالیٰ سے دعائیں کرتے، اور خدا تعالیٰ
بھی میرے والد ماجد کی دعائیں قبول فرماتا اور تمام پریشانیاں اور مشکلات
دور ہو جاتیں، اور ساری عمر یہ دستور رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمنوں کے
بار بار کے حملوں سے خدا تعالیٰ کے فضل سے محفوظ رہے اور اپنے نازک ترین

کام کو خوش اسلوبی سے نبھا کر اپنے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی نظروں میں عزت حاصل کی، اور قادیان کی ۴۶ سالہ زندگی انتہائی خاموشی مگر وقار سے گزاری۔ شکر الحمد للہ!

آخر میں دعا ہے کہ خدا تعالیٰ والد مرحوم سے راضی ہو ان کے درجات بلند فرمائے۔ انکی بخشش فرمائے اور اپنے خاص قرب میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کا حامی و ناصر ہو۔ آمین'

محتاج دعا خاکسار خواجہ بشیر احمد ابن خواجہ غلام نبی مرحوم سابق ایڈیٹر "الفضل" حال فریڈ کفورٹ مغربی جرمنی

(بقیہ صفحہ ۲۵)

میں، علاوہ ازیں آپ کو بوجہ نوجوان آدمی ہونے کے پہلے دفتر پہنچنا چاہیئے" چنانچہ اس محبت بھری سرزنش پر میں محتاط ہو کر جب بروقت پہنچتا تو پھر مناسب الفاظ میں میری باقاعدگی کی تعریف فرما کر حوصلہ افزائی فرماتے۔ اسی طرح بوجہ کم عمری مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو مناسب رنگ میں میری تربیت فرماتے۔

غرضیکہ خواجہ صاحب موصوف مخلص، دیندار، پابند صوم و صلوٰۃ سلسلہ کے اعلیٰ کارکن تھے اور دامے، درمے، سخنے اپنے فرائض کو ادا فرمایا کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ خواجہ صاحب محترم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمائے؛ اور انکی اولاد کو ان کے نقش قدم پر چلا کر خادم احمدیت بنائے۔ آمین ثم آمین

سید اعجاز احمد شاہ، انسپکٹر بیت المال، صدر انجمن احمدیہ ربوہ،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

محترم مکرم معظم جناب چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے والد ماجد مرحوم محترم خواجہ غلام نبی صاحب، سابق ایڈیٹر و مینجر الفضل نے اپنی زندگی میں اپنے حالات قلمبند کئے تھے خاکسار خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے ان حالات کو کتابی شکل میں چھپوا رہا ہے تاکہ ایک لمبے عرصہ تک آپ کے لئے دعاؤں کا سلسلہ جاری رہے۔ آپ سے نہایت ہی عاجزانہ درخواست ہے کہ آپ بھی اپنے مبارک ہاتھوں سے والد ماجد مرحوم کے لئے چند دعائیہ کلمات تحریر فرما دیں، تاکہ وہ بھی کتاب کی زینت بن جائیں اور زیادہ سے زیادہ دعاؤں کی تحریک ہو سکے۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی والی لمبی زندگی عطا فرمائے، اور اپنی محبوب جماعت میں ایک لمبے عرصہ تک قائم رکھے۔ آمین یارب العالمین۔

خاکسار خواجہ منیر احمد، حال فرینکفورٹ
مغربی جرمنی

"فرینکفورٹ
۸ ستمبر ۱۹۷۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحم سے آپ کے والد مرحوم کی مساعی حسنہ کو مشکور فرمائے اور قبولیت سے نوازے اور جنتِ علیا میں ان کا ٹھکانا بنائے اور پس ماندگان کو جادۂ تقویٰ پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

والسلام
خاکسار ظفر اللہ خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

از حضرت مولوی محمد دین صاحب صدر صدر انجمن احمدیہ ربوہ

مکرم خواجہ غلام نبی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ادارہ الفضل میں بطور ایڈیٹر ایک لمبا عرصہ کام کیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواجہ صاحب کے جنازہ غائب پڑھاتے پر جو ارشادات فرمائے وہ اس کتاب کے شروع میں درج ہیں جن کا آخری فقرہ حسب ذیل ہے:-

"میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا (مراد خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم ناقل) جماعت پر ایک بہت بڑا احسان ہے اور جماعت ان کے لئے جتنی بھی دعائیں کرے اس کے وہ مستحق ہیں۔"

حضور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد کی تعمیل میں حصول ثواب کے لئے میں بھی خواجہ صاحب کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب مرحوم

اپنے قرب خاص میں جگہ دے۔ آمین

نیز ان کے بیٹے خواجہ منیر احمد صاحب (حال جرمنی) کو اپنے والد کی خود نوشتہ یادداشتیں شائع کرنے کا اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائے اور قارئین کرام کے لئے اس کتاب کا پڑھنا ازدیاد ایمان کا باعث ہو۔

خاکسار محمد دین، سابق ہیڈ ماسٹر قادیان
حال صدر، صدر انجمن احمدیہ، پاکستان - ربوہ

۱-۵-۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

محترم کیپٹن ملک غلام حسین صاحب نے جو کہ "حیات خواجہ غلام نبی" کا مسودہ مطالعہ اور اظہار رائے کے لئے دیا تو میرا خیال تھا کہ سرسری مطالعہ چند ابتدائی صفحات کچھ درمیان سے اور دو چار ورق آخر سے دیکھنے کے بعد رائے دے دوں گا کہ زیادہ کی فرصت نہیں۔ لیکن جب میں نے محترم خواجہ غلام نبی صاحب سابق ایڈیٹر الفضل کی خود نوشتہ سوانح کا مسودہ پڑھنا شروع کیا تو وہ اتنا دلچسپ اور سبق آموز لگا کہ پڑھے بغیر درمیان میں چھوڑ دینے کو جی نہ چاہا۔

آپ کے حالاتِ زندگی پڑھ کر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کامیاب زندگی کے لئے وسائل کی کمی کبھی روک نہیں بن سکتی۔ ہمت محنت اور جدوجہد میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا برکات پوشیدہ رکھی ہیں۔ رحیم و کریم خدا کے فضلوں کو جذب کرنے کے کیا کیا ذرائع ہیں۔ اور شکرِ نعمت کیسے

شاہراہ ترقی کی طرف راہ نمائی کا موجب بنتا ہے۔ غرض یہ کتاب جو کامیاب
زندگی بسر کرنے کا گر بتاتی ہے مشکلات میں کام کرنے کے اسلوب سے
روشناس کرتی ہے سبق آموز بھی ہے اور بڑی دلچسپ بھی۔

اللہ تعالیٰ محترم خواجہ صاحب مرحوم کو اپنے قرب خاص سے نوازے۔
اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اور انکی نیک اور لائق اولاد کو
احمدیت کا فدائی، خدمت دین کے سلسلہ میں ان کے نقش قدم پر چلنے والا اور بزرگوں
کے ورثہ کی حفاظت کرنے والا بنائے۔ آمین

والسلام خاکسار
ملک سیف الرحمٰن مفتی سلسلہ عالیہ احمدیہ
و پروفیسر جامعہ احمدیہ ربوہ

"خاکسار نے محترم مرحوم غلام نبی صاحب سابق ایڈیٹر الفضل کے حالات
پڑھے۔ مرحوم و مغفور کے سوانح حیات نہایت ہی ایمان افروز ہیں۔ خصوصاً
نوجوانوں کی تربیت اخلاقی اور جذباتی و روحانی کی نشو و نما کے لئے بہترین
نمونہ ہیں۔

مرحوم کا حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مقدس نگاہ میں منظور
نظر ہو کر سلسلہ کی خدمت میں عمر بھر انتھک مساعی جمیلہ میں منہمک رہنا
اور فرائض بھی بڑے اخلاص سے سرانجام دیتے ہوئے آخری سانس جان
آفرین کے سپرد کرنا صداقت سلسلہ کا ایک پُرکیف اعجازی نشان ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم و مغفور کے جنت الفردوس میں بلند سے بلند تر درجات
عطا فرمائے۔ آپ کے واقعات زندگی نسل احمدیہ کے لئے انقلابات دہر کے طوفانوں سے

بچاؤ کے لیے گویا لائف بوائے کا کام دینے والے ہیں۔ پس نوجوانوں کو خصوصاً ضرور ان کا مطالعہ کر کے ان سے مستفیض ہونا چاہیئے۔

خاکسار عبداللطیف بہاولپوری ، ۲۲/۷/۸۳

"مکرم ملک خادم حسین صاحب کی عنایت سے مجھے استاذی المکرم خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر الفضل کے خودنوشت حالاتِ زندگی اشاعت سے قبل پڑھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حالات بہت دلچسپ، فکر انگیز اور ایمان و یقین کو بڑھانے والے ہیں۔

صدق و اخلاص سے بھری ہوئی ایک روح نے اللہ تعالےٰ کی حمد و ستائش اور جذباتِ تشکّر سے لبریز ہو کر اللہ تعالےٰ کے افضال و انعامات سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مربیانہ حُسنِ سلوک اور احسانات، متعدد بزرگانِ سلسلہ کی نوازشات اور ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصہ تک سلسلہ کی قلمی خدمات بجا لانے کی توفیق ملنے کا بہت پُر اثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ یہ بعض ذاتی معاملات کا ریکارڈ ہی نہیں ہے بلکہ قادیان کے روحانی ماحول کی گوناگوں کیفیات اور تاریخِ سلسلہ کے بعض چشم دید واقعات کا ایک دلکش مرقع بھی ہے۔ پھر یہ تذکرہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اللہ تعالیٰ دلی اخلاص کی قدر کرتے ہوئے جب اپنے کسی بندے سے کام لینا چاہتا ہے تو اپنی قدرت نمائی سے ایک ذرۂ بے مقدار

کو تابندگی سے ہمکنار کر دکھاتا ہے اور ایک قطرۂ ناچیز کو دریا کی فیض رسانی کا حامل بنا دیتا ہے۔

اس کا مطالعہ نوجوانوں کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کے نتیجہ میں ان کے اندر بھی خدمتِ دین کی لگن پیدا ہو گی، اور اپنی بے مائیگی کے باوجود آگے آنے اور دین کی سربلندی کے لئے خدمات بجالانے کا حوصلہ بلند ہو گا۔ انشاء اللہ العزیز و باللہ التوفیق۔"

مسعود احمد دہلوی، ایڈیٹر الفضل ۲۴-۲-۲۶

"استاذی المحترم خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم و مغفور کے یہ خود نوشت حالاتِ زندگی بہت دلچسپ، مفید، قابلِ قدر اور ایمان افروز ہیں۔ یہ حالات جماعت احمدیہ کے جس دور سے تعلق رکھتے ہیں وہ تاریخی لحاظ سے بھی ہمارے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی فہم و فراست، قدر شناسی اور اپنے خدام سے شفقت و محبت کے سلوک پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

خاکسار ذاتی طور پر بھی محترم خواجہ صاحب مرحوم کا ممنونِ احسان ہے کیونکہ آپ ہی کی توجہ اور حوصلہ افزائی کے باعث خاکسار طالب علمی کے زمانہ میں ہی الفضل میں مضامین لکھنے لگا، آپ اکثر اہتمام کے ساتھ انہیں شائع کرتے، اور ایسے رنگ میں انکی اصلاح فرماتے تھے کہ وہ خود

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے بھی متعدد مواقع پر ان مضامین کی تعریف فرمائی۔ الحمد للہ!

محترم خواجہ صاحب مرحوم کی ہی تحریک پر خاکسار بالآخر ادارہ الفضل سے منسلک ہوا۔ مجھے خوب یاد ہے، مئی ۱۹۴۶ء میں جب خاکسار عملہ ادارت میں شامل ہوا تو آپ نے بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا۔ خاکسار کو چند ماہ آپ کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا۔ جس محنت انہماک اور توجہ سے آپ کام کیا کرتے تھے اس کا میری طبیعت پر خاص اثر ہے۔

آپ کے زمانہ ادارت میں جماعت پر بڑے بڑے نازک اور مشکل حالات آئے۔ آپ نے بفضلہ تعالیٰ بڑی کامیابی کے ساتھ اور خلیفہ وقت کی منشاء کے مطابق الفضل کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ اندرونی اور بیرونی فتنوں کا مقابلہ کیا۔ سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں کے مفاد کے لئے متعدد قابل قدر مضامین لکھے۔

تقسیم برصغیر اور ہجرت کے موقع پر قادیان میں جو حالات پیش آئے اور حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں انخلاء کے مراحل کو جس طرح خیر و خوبی کے ساتھ طے کیا گیا ان کی تفصیل پر مشتمل آپ نے جو مضامین ریٹائر ہونے کے بعد لکھے وہ بھی تاریخ سلسلہ میں کبھی فراموش نہیں ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ محترم خواجہ صاحب مرحوم کو اپنے قرب خاص میں جگہ دے۔ آپ کے بیٹے عزیز منیر احمد صاحب اور محترم

کیپٹن خادم حسین صاحب کی مساعی قابلِ تعریف اور قابلِ قدر ہیں جن کی بدولت یہ غیر مطبوعہ حالات اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔"

خاکسار خورشید احمد

اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ الفضل۔ ربوہ

۲۳/۷/۷۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دورِ مصلح موعودؓ میں صحافت کے قلمی مجاہد

حضرت خواجہ غلام نبی صاحب بلانوی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو دنیائے احمدیت میں ایک ممتاز و منفرد مقام حاصل ہے۔ آپ نے عہدِ خلافتِ ثانیہ کے صفِ اول کے کامیاب قلمی مجاہد ارشاداتِ مصلح موعودؓ کے امین۔ الفضل کے مدیر شہیر اور دارالشاورت کے معاون اور ایک صاحب طرز ادیب اور محقق و فن عمل کی حیثیت سے لاتعداد دائمی نقوش چھوڑے ہیں۔ جن کی عظمت و اہمیت زمانہ کے گزرنے اور فتوحاتِ احمدیت کے قریب تر آنے کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتی چلی جائیگی۔ اور جیسا کہ سیدنا محمود المصلح الموعودؓ نے اپنے اس پیارے آقا کی وفات پر آپ کی سنہری خدمات کو سراہتے ہوئے وصیت فرمائی تھی، ہماری آنے والی نسلیں بھی قیامت تک سلسلہ احمدیہ کے اس محسن کے لئے

دعائیں کرتی رہیں گی ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت خواجہ صاحبؒ کے شاندار کارنامے ایک مبسوط و مفصل تصنیف کا تقاضا کرتے ہیں۔ تاہم مجھے یہ معلوم کرکے بے انتہا خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کے صاحبزادگان اور مخدومی کیپٹن خادم حسین صاحب کی تحدرہ کوششوں سے آپکی پہلی سوانح عمری اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔ اِن حضرات نے اپنا فرض منصبی کمال خوش اسلوبی سے ادا کر دیا ہے۔ اب یہ ذمہ داری ہم پر آپڑی ہے کہ اس گرانقدر تصنیف کا بکثرت اور بغور مطالعہ کریں۔ تاہم یہی اس بہادر سپاہی کی روح زندہ رہے اور خلافت احمدیہ کو غلام نبی جیسے فدائی اور شیدائی ہمیشہ میسر آتے رہیں۔ وَمَا ذٰلِکَ بِعَزِیْزٍ ؛

والسلام

خدام احمدیت کا ادنیٰ ترین خادم دوست محمد شاہد

۷ رجون ۱۹۷۳ء

ایک خاموش متین اور صاحبِ بصیرت بزرگ

حضرت خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم

(از عبدالسلام صاحب اختر ایم اے)

حضرت غلام نبی صاحب مرحوم و مغفور کا ذکر آیا ہے تو کئی سوئی ہوئی یادیں جاگ اُٹھی ہیں اور نگاہوں کے سامنے ایک پُر وقار شخصیت کا نقشہ گھوم پھر رہا ہے۔ جس کی نگاہیں کاغذات کی حدود سے گزرتی ہوئی ان جذبات پر آکر ٹھیر جاتی تھیں جو تحریر کا سرچشمہ ہوتے تھے، اور بین السطور معانی کا گنجینہ بن کر صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتے تھے۔

منظومات کا سلسلہ اس زمانہ میں نسبتاً کم تھا سیاسی طوفانوں کے رُخ کچھ اس قسم کے تھے کہ ہر شخص کو ایک نامعلوم قسم کی تشویش لاحق تھی کہ نہ جانے اس ملک میں امن و امان کی کیا صورت ہوگی۔ تاہم جماعت احمدیہ کے تمام افراد کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک سکون اور اطمینان کی سی کیفیت حاصل تھی۔ کیونکہ حضرت مصلح موعودؓ کی ذات خود بیداری اور استحکام کا مظہر تھی، اور حضور مختلف مقامات پر سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کے دَورے فرما رہے تھے۔

خاکسار کی اَدبی زندگی کا اس وقت آغاز تھا۔ مَیں شعر کہتا تھا مگر کم کبھی دو چار مہینوں میں چند اشعار ہو جاتے تھے۔ ان اشعار میں

مسلمانوں کی بقا اور سلامتی کا جذبہ، الفاظ کی رعنائیوں پر غالب ہوتا۔
پھر بعض اوقات چند اشعار خواجہ صاحب کو "الفضل" میں اشاعت کے لئے
بھیج دیتا، اور چند ہی دنوں کے بعد خواجہ صاحب کی طرف سے ایک
شکریہ کا کارڈ، اور بعض اوقات اسی کارڈ میں میرے کسی مصرعہ پر کوئی
ترمیم لکھی ہوئی ہوتی۔ اس ترمیم سے بعض اوقات مجھے اتفاق ہوتا
لیکن میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ یہ ترمیم اس قسم کی ہوتی کہ نہ تو اس سے
مصرعہ کے وزن یا بحر پر کوئی اثر پڑتا اور نہ ہی نفسِ مضمون پر۔ البتہ
اس ہیر پھیر کو میں زبان کی "عمدہ ترکیب" سمجھتا وہ اسے "طولِ کلام"
سمجھتے۔ اور کبھی کبھی یہ سلسلہ بڑی گفتگو اور بحث کی صورت اختیار کر لیتا۔
ایک مرتبہ خاکسار رخصت پر قادیان آیا ہوا تھا اور محکمہ سٹیشن کی
سڑک سے گزر رہا تھا کہ یکدم مجھے اوپر کی کھڑکی سے کسی نے پکارا۔ میں نے اوپر دیکھا
تو خواجہ صاحب کسی اخبار کا پرانا پرچہ ہاتھوں میں لئے تشریف فرما تھے۔
میں اوپر گیا تو خواجہ صاحب کے ہاتھوں میں "الہلال" کا پرچہ تھا جو مولانا
آزاد کا مرتب شدہ تھا۔ خواجہ صاحب بہت تپاک سے ملے، اور بڑی
دیر تک انہی ادبی ترکیبوں پر بات کرتے رہے۔ پھر فرمانے لگے کہ میں تو
مختصر گوئی کا قائل ہوں۔ بے شک آپ نے اقبال اور آزاد کے جو حوالے دیئے
ہیں وہ درست ہیں مگر ہم تو حضرت "سلطان القلم" کے ادب کے قائل
ہیں جو کوزہ میں دریا بند کرتے ہیں اور قطرہ سے آبشار بناتے ہیں۔
میں نے ہنس کر کہا کہ "خواجہ صاحب! اس وقت تو آپ خود ایک

"ادبی ترکیب" بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہنس پڑے، چائے منگوائی، اور
مجھے کہنے لگے "آپ لکھتے رہیں۔ آپ کے کلام میں بڑا زور اور بڑی روانی
ہے۔"

غرض اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں حیران ہوا کہ میں نے
اپنے خط میں جن "ادبی ترکیبوں" کا حوالہ دیا تھا اور کئی مثالیں دی
تھیں وہ باقاعدہ ان کا مطالعہ اور انکی پڑتال کر رہے تھے، اور
پھر یہ مغرب کی اذان کے قریب کا وقت تھا جبکہ دفتری اوقات
نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں محنت سے کس قدر
شغف تھا اور کتنی دل سوزی کے ساتھ وہ بات کی تہ تک پہنچنے
کی کوشش کرتے تھے!

میرا اللہ ان پر اپنی مغفرت اور قبولیت کی چادر پھیلائے
اور انہیں بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین
والسلام
عبدالسلام اختر (ایم اے)

مکرم و محترم کیپٹن ملک خادم حسین صاحب کے ذریعہ معلوم ہو کر بہت خوشی
ہوئی کہ مکرم محترم خواجہ غلام نبی صاحب نے اپنے جملہ حالات زندگی کو خود اپنی قلم
سے لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔ بعض لوگ تو شاید نمائش کے خیال سے ریکارڈ رکھتے
ہونگے لیکن مکرم خواجہ صاحب کی جس طرح عام معمولی کیفیت سے ترقی کر گئے

سلسلہ کے اہم مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُن کی اَن تھک محنت کو تبدیل فرمایا۔ یہ اُس کا احسان تھا اور غالباً اسی جذبہ اور شکرانہ کی کیفیت نے مکرم خواجہ صاحب سے انکی سوانح زندگی کو خود ان کے قلم سے لکھوایا جو دوسرے احباب کے لئے بھی محرکہ ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ ؂

"خاکسار کو ۱۹۱۹ء میں قادیان آنے کا موقعہ ملا جبکہ خاکسار چھٹی جماعت میں یہاں داخل ہوا۔ اپنے بچپن کی وجہ ابتدائی چند سالوں میں تو مکرم خواجہ صاحب سے ملاقات کا موقعہ نہ ملا۔ لیکن جب خاکسار ۱۹۲۳ء میں مدرسہ احمدیہ میں داخل ہوا، تو دفتر الفضل بھی مسجد مبارک کے قریب ہی تھا اور حضرت نواب محمد علی خان صاحب والا مکان کہلاتا تھا جس کے اوپر کے حصہ میں مکرم ڈاکٹر حشمت اللہ خان صاحب رہائش رکھتے تھے اور اس کے ساتھ سے سیڑھیاں حضرت حافظ روشن علی صاحب کے چوبارہ کو جاتی تھیں، اس مکان کے نچلے حصہ میں دفتر الفضل ہوا کرتا تھا۔

(آگے دیکھیں صفحہ ۱۹)

مکرم خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم کی خوش مذاق طبیعت اور مسکراتا باوقار اور بیضوی خوش رنگ چہرہ ہنستا شگفتہ بغیرہ رہتا تھا۔ اسی طرح ان سے بار بار ملنے کی وجہ سے اُنس پیدا ہوا۔

مکرم خواجہ صاحب کے تعلقات ہر ایک کے ساتھ ہی خوشگوار تھے، حتیٰ کہ مکرم حسن صاحب رہتاسی، جو سلسلہ کے ایک مشہور فی البدیہہ شعر کہتے تھے، اور خاص حساس اور خاص شاعروں جیسی نازک طبیعت کے مالک اور صاف گو شاعر تھے۔ انہوں نے بھی جب خواجہ صاحب کی بھینس مر گئی، تو اس صدمہ میں مکرم خواجہ صاحب کا ساتھ دیا اور یہ رُباعی کہی جو اُن کے کلام دیوانِ حسن میں چھپ چکی ہے کہ

میدان کی پہاڑ کی خشکی تری کی بھینس!
کچھ غم نہیں مرے جو کہیں بھی کسی کی بھینس
کیونکر نہ سوگوار ہو بھینسوں کا خاندان!
جب کوچ کر گئی ہو غلام نبی کی بھینس

اللہ تعالیٰ مکرم خواجہ صاحب کے درجات کو بلند فرمائے، اور اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے، اور ہم لوگوں کو ان کے جذبہ کی قدر کرنے اور اسے اپنانے کی توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین

خاکسار (مولوی) عبدالرحمٰن انور

سابق پرائیویٹ سیکرٹری حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی

ربوہ ۲۵/۲/۷۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ کا ارسالی کردہ مسودہ اول تا آخر پڑھا۔ کتاب "چھبیس سال (۲۶) قادیان میں" کیا ہے؟ احمدیت کے ایک بطلِ جلیل کی سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل کی ایک ایسی سرگزشت جو دلچسپ ہی نہیں ایمان افروز بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم کو جنہوں نے صفحۂ قرطاس پر خلوص و صداقت اور محبت و عقیدت کے ایسے گراں بہا موتی بکھیر دیئے ہیں جن کی آب و تاب رہتی دنیا تک آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی رہے گی!

میرے دردمند دل پر یہ کتاب پڑھتے وقت کیا گزری؟ میں اس کی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہوں، البتہ اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ مطالعہ کے دوران کئی دفعہ ضبط کا دامن چھوٹ چھوٹ گیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ہاتھ دعا کے لئے خود بخود اٹھنے لگے اور دل میں وہی کیفیات موجزن ہو گئیں جن سے خود مصنف سرشار تھا — اور شاید انشا پردازی کا یہی وہ کمال ہے جو کسی انشا پرداز کی عظمت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے۔ آمین

اللہ رے انفاسِ مسیحا کے کرشمے
جس فرد کو دیکھا وہی کامل نظر آیا

مبشر احمد راجیکی، ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مکرم و محترم ملک خادم حسین صاحب نے مجھے مکرم و محترم خواجہ غلام نبی صاحب ایڈیٹر الفضل کے خود نوشت حالات زندگی کا مسودہ مطالعہ کے لیے بھجوایا۔ میں نے اس مسودہ کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ میری یہ رائے ہے کہ سلسلہ کے کارکنوں اور نوجوان خدام کے لیے ان حالات میں کئی سبق ہیں۔ سلسلہ کے ان خدام نے خلیفۂ وقت کی راہ نمائی اور دعاؤں سے جن نامساعد حالات میں سلسلہ کی خدمات سرانجام دیں وہ دینی جماعتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اللہ تعالےٰ سے دلی دعا ہے کہ وہ ہمیں احمدیت کی بے لوث خدمت کرنے کی توفیق دے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو زندہ رکھنے کا عزم عطا فرمائے۔ آمین

خاکسار

غلام باری سیف

۸۳/۲/۲۴

"یادوں سے فطرت کو طبعی لگاؤ ہے۔ تلخ یادیں بھی نہیں بھولتیں۔ حسین اور خوش کن یادیں کیونکر دل سے محو ہو سکتی ہیں۔ وہ تو انسانی زندگی کی روح اور اس کی تازگی کو قائم رکھنے والی ہوتی ہیں۔ "حیات خواجہ غلام نبی" بھی ایک ایسی ہی دلچسپ اور دل پسند یادداشت ہے جو انکی پیاری اولاد ان کے پیارے عزیزوں، مخلص دوستوں کے لیے تو محبوب ہے

ہی جماعت احمدیہ کے دوسرے افراد کے لئے بھی بہت خوشی اور ان کے جذبات تشکر کو ابھارنے والی ہے۔

تاریخ احمدیت کے نقوش کو تیار کرنے میں محترم شیخ محمود احمد صاحب مرحوم کا نام ناقابل فراموش حصہ ہے، اور ان کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ الفضل کے صفحات آپ کی مساعی کا زندۂ جاوید ثبوت ہیں، اور زندہ قومیں اپنے محسنوں اپنے جانبازوں اور قوم کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والوں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ اور سوانح حیات کا یہ مرقع اسی سلسلہ کی ایک کامیاب کوشش ہے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور نوجوان نسل کے لئے اس کا مطالعہ باعث خیر و برکت ہو۔ آمین

امۃ الرشید شوکت، مدیرہ مصباح۔ ربوہ

"مجھے محترم غلام نبی صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر الفضل کے یہ خود نوشت حالات پڑھنے کا موقعہ ملا۔ قادیان کے دینی ماحول کے متعلق میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا، اور میرے لئے یہ حالات ازدیاد ایمان کا باعث ہے۔ جو بھی اس کتاب کو پڑھے گا وہ قادیان کے دینی ماحول اور وہاں کے لوگوں کی شفقت و ہمدردی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے لکھنے والوں اور اسے شائع کر کے منظر عام پر لانیوالوں کو بہت بہت جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان کا حافظ و ناصر ہو، اور اس کتاب کو بھی نافع الناس اور لوگوں کی ہدایت و نصیحت کا باعث بنائے۔

مکرم خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم بہت محنتی، کم گو، اپنے فرائض کو عمدہ طور پر پورا کرنے کے لئے ہر دم اپنے کام میں مصروف رہتے تھے اور پنجگانہ نمازوں میں مساجد میں حاضر ہوتے۔

چنانچہ ان کے کئی کارناموں میں سے ان کا تیار کیا ہوا ۴۳ صفحات کا ایک رسالہ بنام "پنڈت لیکھرام کا واقعہ قتل" مطبوعہ جنوری ۱۹۲۶ء میرے پاس ہے، جس میں اس واقعہ پر مفصل روشنی ڈال کر اور دلائل جمع کر کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس پیشگوئی کا حرف بحرف پورا ہونا ثابت کیا ہے۔ (یہ پیشگوئی ۶ر مارچ ۱۸۹۷ء کو پوری ہو چکی تھی)۔ اسی ایک کتاب سے انکی محنت اور دینی انہماک کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ انکی باقی تصانیف کا تو مجھے پورا علم نہیں مگر یہ ایک ہی تصنیف ان کے علم اور عمل کا تعارف کرانے کے لئے کافی ہے۔ اس وقت ان کی یہ تصنیف جماعت کے بزرگوں نے پیشگی رقمیں بھیج بھیج کر اور ایک ایک سو کاپیاں خرید کر آریوں اور دیگر لوگوں میں مفت تقسیم کرنے کے لئے اپنی جماعتوں میں منگوائی تھیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے خواجہ صاحب کی ایڈیٹری یا دیگر دینی خدمات کو قبول فرما کر ان کو اجرِ عظیم بخشے، اور انکی اولاد کو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق بخشے۔ آمین

راقم قریشی محمد حنیف قمر ملوی، سائیکل سیاح،

آنریری مبلغ، نزیل ربوہ

"خواجہ غلام نبی صاحب مرحوم کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحت کے بارے میں بالکل صحیح خبر شائع کرنے کا اہتمام فرماتے، بلکہ الفاظ تک بھی حضور رضی اللہ عنہ کے ہی شائع ہوتے۔

خواجہ صاحب دفتری اوقات میں اول وقت پر یعنی عین وقت پر نہیں بلکہ وقت سے پہلے تشریف لاتے، اور سارا وقت لگا کر تشریف لے جاتے۔ ان دنوں خبریں ریڈیو سے لکھ کر شائع کی جاتی تھیں۔ چنانچہ محترم خواجہ صاحب خبروں کے وقت جلدی جلدی ریڈیو سے خبریں لکھنے میں ماہر تھے، حافظہ آپ کا بہت اچھا تھا۔

ایڈیٹوریل لکھتے وقت بلا جھجک قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے اور خوب لکھتے۔ طبیعت خاموش پائی تھی، اپنے مخصوص احباب میں بیٹھتے تو باوقار گفتگو فرماتے۔ فضول باتوں سے اجتناب فرماتے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند۔ دفتری کام میں جو ذمہ دار اخبار کی ذمہ دار ایڈیٹری کا تھا، انہماک کے باوجود نماز کا وقت ہونے پر نماز ادا فرماتے اور پھر اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں لگ جاتے۔

خواجہ صاحب محترم اپنے ماتحتوں پر رعب ڈال کر نہیں بلکہ دوستانہ فضا میں کام لیتے۔ چنانچہ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ محترم خواجہ صاحب نے کبھی مجھے ڈانٹا ڈپٹا نہیں تھا، بلکہ اگر کبھی تاخیر سے دفتر حاضر ہوتا تو صرف یہ فرماتے، "آپ نوجوان ہیں۔ میں بوڑھا ہوں۔ میں پہلے آ گیا اور آپ بعد

(حاشیہ میں ہاتھ سے لکھا ہوا: ۱۹۴۳ ... [illegible])

قطعہ سن وفات حضرت خواجہ غلام نبی صاحب

تاریخِ اشاعتِ سوانحِ حیات

۱۹۶۸ء

سوانحِ عمرِ غلامِ نبی

۳۴۱ — ۲۴

بہ ایزادِ لفظِ "شما" و "ولی"

۱۹۵۵

یہ انیس صد اور پچپن کا سن

خود ان کے ہی ہاتھوں سے لکھی گئی

وہ پچپن کا سن جب تہتر بنا

تو پھر اس کی آکر اشاعت ہوئی

منیر احمد اس کے مرتب ہوئے

اشاعت کی تکمیل خادم نے کی

تو دنیا و دیں میں ہوا سرخرو

خدا تجھ کو بخشے غلامِ نبی!

خادم

معذرت

قارئین کرام کی خدمت میں گذارش ہے کہ خاکسار اشاعت کتاب کے دوران ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے صاحب فراش رہا اور پروف وغیرہ صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ اس سے غلطیاں کافی رہ گئی ہیں صحتنامہ شامل کتاب کر دیا ہے اس لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ خادم

صحت نامہ کتاب "چھتیس سال قادیان میں"

صفحہ نمبر	سطر	صحیح الفاظ
ب	۶	جسے
ج	۱۵	غلط انہیں
۲	۱۵	لکھی
۳	۶	بھیجا
۴	۲	گھر سے
۸	۱	وہاں میرا
۱۱	۱۰	پڑھائی
۱۲	۱۲	ہوش
۱۴	۱۶	چلے گئے
۱۵	۶	وجہ
۱۷	۱	لکھنؤ حذف کیا جائے
۱۷	۲	بھٹہ
۲۰	۴	دوران
۲۰	۸	میسر تھیں
۲۰	۱۸	کا

صفحہ	سطر	صحیح الفاظ
۲۱	۵	پیر
۲۳	۸	میں نے رات
۲۳	۱۸	کسی
۲۵	۱۱	اَغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ
۲۷	۵	نظر انداز
۳۰	۱۵	دنیا
۳۸	۱۴	پیغامیوں
۳۹	۱	بخاری
۴۰	۱۳	لدھانہ
۴۲	۱۸	ہوگا
۴۳	۸	بھی
۴۳	۱۷	مجھے
۴۵	۶	سے
۴۶	۴	رہا
۴۶	۹	خود
۴۷	۵	درس
۴۷	سطر آخری	حقائق القرآن
۶۰	؍؍	استعمال
۶۳	۸	انکو
۶۴	۳	ثبوت
۶۴	۷	اڑھائی
۶۷	۷	جلسہ
۶۷	۸	جلسہ گاہ

صفحہ	سطر	صحیح الفاظ
۶۸	۸	متاہلانہ
۶۸	۹	پھر
۷۸	۹	حیران
۸۳	۴	اختیار
۹۰	۲	پسندیدگی
۹۷	۱۰	پٹتی
۱۰۰	۸	خود
۱۰۱	۱۶	مضمون
۱۰۱	۱۹	گیا
۱۲۰	۷	دیکھی
۱۲۰	۷	پادری صاحب
۱۲۲	۱۱	دھاڑیں
۱۲۶	۱۳	کی ڈاکٹری محذوف کیا جائے۔
۱۲۶	۱۵	وہی
۱۳۲	دوسرا پیرا	بغلی سُرخی: متاہلانہ زندگی
۱۴۲	۲	بار
۱۴۶	۲	رات دن
۱۴۶	آخری	"یہ" کی جگہ "ہم"
۱۵۷	۱۱	رحمت از شفقت محذوف ہو
۱۵۹	۴	"نے" کی بجائے "کے"
"	۸	چلے گئے
۱۶۱	۱۴	دیا

صفحہ	سطر	صحیح الفاظ
۱۶۲	۱۰	اخبار نویسی
۱۶۵	۴	بڑھاتے گئے
۱۶۵	۵	"جماعت احمدیہ کے خلاف" کے بعد- زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ احرار کو جماعت احمدیہ کے خلاف
۱۶۸	۴	تین
۱۷۳	۱۷	سرانجام دو
۱۸۰	۴	ہوگئیں
۱۸۱	۶	بیمار ماں
۱۸۲	۷	بھی
"	۱۶	"تھا" کی بجائے "تھے"
"	۱۸	ناکافی تھا
۱۸۴	۱۰	مگر یہ عجیب بات ہے۔
۱۹۳	۹	بقیہ ص ۲۱۲
۲۰۸	۳	بعد
۲۰۹	آخری	آگے دیکھیں ص ۲۰۷
۲۳۳	۱۹	فوراً تیار